چاند نگر
کی
شہزادی
سُندس جبیں

چاند نگر کی شہزادی

''زہریلا کیل اس کے دل میں لگا تھا، کہانی اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہی تھی پھر چاند نگر کی شہزادی مرگئی اور کہانی ختم ہوگئی لیکن نہیں ختم کہاں ہوئی، کہانی تو شاید ابھی شروع ہوئی تھی۔''

''کیا؟'' وہ بے ساختہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''شہزادی مرگئی؟'' اس نے زرد چہرے کے ساتھ بے یقینی سے پوچھا تھا۔

''بھلا شہزادی کیسے مرسکتی ہے جبکہ وہاں کوئی دیو بھی نہیں تھا؟'' اس کی معصوم سوچ میں بس یہی آسکا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ کچھ کہانیوں کا آغاز وہیں سے ہوتا ہے، جہاں کہانی بیان کرنے والا اپنی الفت میں اینڈ کررہا ہوتا ہے۔☆

☆.....☆.....☆

''تمام گواہوں کے بیانات اور شواہد کی بنا پر یہ پنچائیت فیصلہ کرنے کا اختیار حیدر چوہدری کو دیتی ہے، میں ایک رکن کی حیثیت سے ان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنا فیصلہ سنائیں۔'' مجمع پر سناٹا طاری تھا، ہر شخص سانس روکے پہلی قطار میں تیسری کرسی پر بیٹھے ''حیدر چوہدری'' کے لبوں کی جنبش کا منتظر تھا، پنچائیت کا رکن اب

پھر سے اپنی نشست پر جا چکا تھا، مگر ''حیدر چوہدری'' اسی طرح بیٹھا رہا، ہجوم میں دبی دبی سی بے چینی پھیلتی گئی، مگر اس سے پہلے کہ یہ بے چینی بڑھ کر سرگوشیوں کی شکل اختیار کرتی اس کی بارعب اور بھاری آواز گونجنے لگی۔

''میں حیدر چوہدری اس پنچائیت کے دیئے گئے اختیار کے مطابق اپنا فیصلہ سنا رہا ہوں۔''

اس کا لہجہ مستحکم تھا اور چہرہ پتھر۔

''میں اپنی بیوی دارین چوہدری کو خود پر حرام کرتا ہوں، آج کے بعد اس کی حیثیت ''شیش محل'' کے قیدی کی ہوگی، میں اسے عمر قید کی سزا سناتا ہوں، آج کے بعد نہ یہ کسی انسان کو دیکھ پائے گی اور نہ ہی کھلے آسمان کو۔'' اس کی بات ختم ہو چکی تھی مگر ہجوم ابھی تک سحر میں تھا، لمبی قطار میں موجود پنچائیت کے ارکان پنڈال میں اکٹھے خاندان کے افراد اور لکڑی کی آبنوسی میز کے قریب بڑی سی گرم شال میں لپٹی دارین چوہدری زمین پر بیٹھی ہوئی تھی، اپنے شوہر کے منہ سے اس فیصلے کو سننے کے بعد اس نے ایک لمبی سی ہچکی لی اور اس کا سر زمین سے جا لگا۔

بالکل وہاں جہاں غرور سے اکڑی اس کے شوہر کی کھیڑی تھی، اس کھیڑی کی نوک دارین کے ماتھے پر چھب رہی تھی، مگر وہ اسی طرح گری رہی غالباً وہ بے ہوش چکی تھی، ہجوم سے کچھ خواتین نکل کر آگے بڑھیں اور تیزی سے اسے ہلایا جلایا مگر اس کے ساکن وجود میں کوئی جنبش نہ تھی۔

بہت سے ہاتھوں نے اسے اٹھا لیا تھا اور پھر اسے ''شیش محل'' کے عقب میں بنے گھوڑوں کے اصطبل کے ساتھ چھوٹے کمرے میں ڈال دیا گیا تھا۔

زندگی کی کسی وحشت کے ستم کے ہاتھوں
مات کھائے ہوئے کمزوروں کو
موت میں راستہ ملتا ہے تو جیون کا خدا ہی حافظ
درد فاتح ہو تو پھر جی کے بھی کیا کرنا ہے
موت ہی رستی ہو جن زخموں سے
ان کو پھر سی کے بھی کیا کرنا ہے!!!

☆.....☆.....☆

چوہدری مہرداد نے ہلکا سا ہنکارا بھرا اور اپنی ہمشیرہ عنایت بی بی کو دیکھا۔

''دیکھیں بی بی ہم سے جو ہو سکتا تھا ہم نے کیا، ہم یہ بات نہیں سننا چاہتے تھے کہ لوگ یہ کہیں کہ ہم نے اپنی بیوہ بہن کا خیال نہ رکھا یا پھر اسے حق سے محروم رکھا، آپ کا جائیداد میں حصہ میں پہلے ہی آپ کے نام کر چکا ہوں، اس لیے آپ عملی طور پر اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہیں، مگر اس کے باوجود آپ نے میری رائے کو اہمیت دی مجھے خوشی ہے، میں نے اپنے ذرائع سے تحقیق کروالی ہے اور اسی بنا پر میں یہ کہتا ہوں کہ مجھے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے، آپ اپنی سہیلی زبیدہ خانم کو ہاں کر دیجئے۔'' انہوں نے نپے تلے لہجے میں کہہ کر بات سمیٹی تھی، عنایت بی بی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

''میں آپ کی مشکور ہوں بھائی صاحب! آپ کی رضامندی میری دلی خواہش تھی۔'' ان کی آواز خوشی سے لرزاں تھی، چوہدری مہرداد کے چہرے پر شفقت بھری مسکراہٹ آ گئی۔

''اب آپ اپنی سہیلی کو بلائیے اور کوئی مناسب سی تاریخ رکھ دیجئے، لمبی تیاریاں کرنی ہیں، آخر بیٹی رخصت کرنی ہے ہم نے۔'' وہ فکرمندی سے گویا تھے، وہ سر ہلاتی ہوئی اٹھ گئیں، جلد ہی یہ خبر آگ کی مانند پھیل گئی، دارین کی شادی طے ہو رہی تھی۔

اور بڑے سے صحن کے پار جھولے پہ لہراتی دارین جس کی کھلکھلاہٹ سن کر حویلی کی اکثر بڑی بوڑھیاں دہل جایا کرتی تھیں اور جھٹ سے اسے ٹوکا کرتی تھیں، اب بھی اس کی عزیز ترین سکھی فیروزاں اس کے کمر تک آتے بالوں میں گلاب اور موتیے کی کلیاں سجا رہی تھی اور ہنستی ہوئی اسے تنگ کر رہی تھی۔

عنایت بی بی نے مسکراتے ہوئے یہ منظر دیکھا، ان کی بیٹی بہت حسین تھی اس کے اسی حسن سے خوفزدہ ہو کر انہوں نے اس کی شادی کا فیصلہ لینے میں اتنی جلدی کی تھی، ورنہ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی صرف سترہ سال، ایک سال پہلے اس نے دسویں پاس کی تھی، جس کے بعد کا ایک سال انہوں نے اسے گھریلو امور میں اس طرح الجھایا تھا کہ وہ کبھی کبھار چیخ پڑتی تھی، وہ آزاد پنچھی تھی، پابندیاں اور قید اس کے لیے نہیں تھیں، اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیتوں میں پھرنا اور جھولے جھولنا اس کا من پسند مشغلہ تھا جب وہ ہر ایک کو تنگ کرتی اپنی مخصوص کھنکھناتی ہوئی ہنستی ہنستی تو گالوں میں پڑتے چاہ زنخداں اور عارضوں پر پھیلتی لالی اسے اور بھی دلکش بنا دیتی تھی، ایسے میں اس

کی چمکتی کانچ سی کالی آنکھیں پانیوں سے بھر جاتیں، خاموش بیٹھنا تو اسے آتا ہی نہ تھا، ہر وقت کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شرارت میں مصروف اس کی زندگی بڑی رواں دواں اور روشن روشن تھی، بے فکری، الہڑ اور چنچل سی دارین چوہدری، بلاشبہ اس حویلی کی بلبل تھی، کبھی کبھی وہ سوچتی اگر وہ ہنسنا چھوڑ دے تو شاید اس کی سانسیں ہی رک جائیں اور اگر وہ بولنا چھوڑ دے تو دوسروں کی، پھر خود ہی اپنی سوچ پر کھلکھلا اٹھتی۔

دوسرا اہم کام اس کی زندگی میں کھانا تھا، وہ کھانے کی بے تحاشا شوقین تھی، چٹ پٹے مزے دار کھانے کھاتی اور کبھی کبھار تو عنایت بی بی خود اس کی فکر کرنے لگ جاتیں کہ یہ بے دریغ کھانا پینا کہیں اسے فربہی کی طرف نہ مائل کر دے، مگر حیران کن طور پر ایسا کچھ نہ تھا وہ اسی طرح دبلی پتلی سی تھی، چلتی پھرتی ایسی مورنی سی لگتی کہ وہ نظروں میں ہی بلائیں لیتی تھیں۔

اور اب اسے ہنستے دیکھ کر ان کی نم آنکھیں یہ سوچ رہی تھیں کہ ابھی تو انہوں نے اسے اپنے پاس بٹھا کر اسے یہ خبر بھی سنانی تھی کہ وہ اس کی شادی کر رہی تھیں، اسے ذہنی طور پر تیار کرنا تھا کیونکہ جسمانی طور پر وہ بھلے ہی سترہ سال کی تھی شادی کے حوالے سے اس کا تصور اور سوچ صرف اسی حد تک محدود تھی کہ شادی کا مطلب نت نئے زرق برق کپڑوں کا ملنا اور ڈھیروں رسموں کا پلندہ تھا جو کہ اسے از حد پسند تھیں، اس کی اس بچکانہ سوچ اور غیر پختہ شعور کی وجہ سے ہی تو انہوں نے اس کے لیے اپنی عزیز ترین سہیلی زبیدہ خانم کے بیٹے کا انتخاب کیا تھا اور اپنے اس فیصلے پر دل سے مطمئن بھی تھیں۔

''ایک باشعور اور پختہ سوچ کا حامل مرد عورت کو سنبھال لیتا ہے اور اس کی بے وقوفیوں کو بھی، خدا کرے دارین بھی ہمیشہ خوش رہے۔'' وہ دعا گو تھیں۔

☆.....☆.....☆

''چاند نگر'' کے حسین سبزہ زار، سنہری پھلوں سے سجے سبز درخت گل لالہ، گل نرگس اور گل بنفشہ کے پھول جن کی دھیمی سی مہک ماحول کو اپنے فسوں میں جکڑے ہوئے تھی۔

شہزادی اپنی خادماؤں اور کنیزوں کے جلو میں اس پر فضا مقام پر چہل قدمی کے لیے آئی ہوئی تھی، اس کا عالیشان لباس کئی کنیزوں نے اطراف سے سنبھالا ہوا تھا، اس کے حسین بال بڑے خوبصورت طریقے سے

بنائے گئے تھے اور اطراف میں گرتی کچھ لٹیں اس کے گالوں کو چھوتی اسے مزید دلربا بنا رہی تھیں، اس کے ساتھ چلتی کنیز نے ایک گل رنگ طشتری تھام رکھی تھی جس میں قسم قسم کے پھل تھے اور وہ منتظر تھی کہ شہزادی کے حسین ہاتھ ان میں سے کسی پھل کو شرف قبولیت بخشیں مگر وہ اردگرد کے نظاروں میں گم تھی، جہاں افق پہ ہفت رنگی دھنک پھیلی ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

اس نے خود آئینے میں ہر ہر زاویے سے دیکھ لیا تھا مگر تسلی ہی نہیں ہو پا رہی تھی، وہ تھوڑی دیر خاموشی سے کھڑی رہی، پھر اس نے قدرے پریشانی سے اپنے عکس کو گھورا۔

''لڑکیاں تو اپنی شادی پر اتنا شرماتی ہیں اور مجھے ذرا شرم نہیں آ رہی۔'' اس نے کوفت سے سوچا۔

پھر اس نے ذرا سی آنکھیں پٹپٹا کر شرمانے کی ناکام کوشش کی جو کہ واقعی ناکام ہی تھی، پھر اس نے ہاتھوں سے آدھا چہرہ ڈھانپ کر مسکراتے ہوئے خود کو دیکھا، پھر آنچل کا کونا دانتوں تلے داب کر دیکھا، مگر تسلی کسی سے نہ ہوئی، اس نے منہ بناتے ہوئے اپنی حسین بالوں کی چوٹی کو انگلیوں کی پوروں سے ذرا سا چھوا اور پھر بیڈ پہ بیٹھ گئی، آج صبح ہی تو اماں نے اسے پاس بلایا تھا اور کتنے پیار سے اسے سمجھایا تھا کہ اب اس کی شادی ہے، وہ اچھل کود بند کر دے، اسی وجہ سے تو حویلی میں دبی دبی سرگوشیاں اٹھ رہی تھیں، ممانیوں کی اعتراضات تھے کہ اتنی کم عمری میں اس کی شادی کا فیصلہ انتہائی غلط تھا، اس میں ذمہ داری اور سنجیدگی نام کو نہ تھی اور ان کے خیال میں جلد بازی میں کیا گیا فیصلہ کوئی اتنا بہتر نہ تھا، مگر عنایت بی بی کو اپنی بچپن کی سکھی زبیدہ خانم پر اندھا اعتماد تھا، وہ جانتی تھیں ان کا فیصلہ کسی صورت غلط نہیں تھا، وہ دلی طور پر از حد مطمئن تھیں، چوہدری مہر داد کی اثباتی مہر کے بعد انہیں بھابیوں کی رائے کی اتنی خاص پرواہ نہ تھی، انہوں نے اپنے بھائی کو اپنے ہونے والے داماد کے کوائف بڑے فخر سے گنوائے تھے۔

''بھائی صاحب! ذات برادری کا مسئلہ نہیں، وہ بھی خالص چوہدری ہیں، اکلوتا بیٹا ہے۔ زبیدہ کا، انتہائی لائق فائق اور پڑھا لکھا ہے، اونچا افسر ہے، راج کرے گی دارین، ہمیں اور کیا چاہیے؟'' وہ تصدیق چاہ رہی تھیں، انہوں نے سر ہلا کر تائید کی تھی۔

''میں مل چکا ہوں اس سے، بہت سلجھا ہوا سنجیدہ مزاج آدمی ہے، رشتوں کا مقام جانتا ہے، ہماری بچی اس سے عمر میں کافی چھوٹی ہے مگر اس سے فرق نہیں پڑتا، مجھے آپ سے اتفاق ہے بی بی کہ وہ پختہ شعور کا حامل مرد ہماری بیٹی کی نادانیوں کو سنبھال لے گا اور یہاں یہ بھی بتادوں آپ کو، ہماری دارین اتنی بھی کم عقل اور بے وقوف نہیں، حالات کے مطابق ڈھل جانے کا بہت حوصلہ ہے اس میں۔'' وہ مطمئن سے انہیں یقین دلا رہے تھے۔

''سمجھوتہ اور برداشت تو لڑکیوں کو گھٹی میں پلایا جاتا ہے، اگر حالات مشکل ہوں تو ان کا مزاج ہر طرح کی لچک رکھتا ہے، دوسرے وہ لڑکیاں جن کے سر پہ باپ کا سایہ نہ ہو ان کے لیے شوہر کے گھر اکڑ دکھانے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، میری دارین اس بات سے بخوبی آگاہ ہے اور مجھے یقین ہے اگر اسے مسائل درپیش ہوئے تو وہ بخوبی نپٹ لے گی۔'' وہ نم آنکھوں کے ساتھ مگر مستحکم لہجے میں بولی تھیں۔

☆.....☆.....☆

جمعرات کی شام اسے نسبتاً پرانے لباس میں مایوں میں بٹھا دیا گیا، ڈھولک رکھ دی گئی، ہر روز رات کو ساری لڑکیاں اکٹھی ہو کر نت نئے ماہیے اور ٹپے گاتیں جن میں شوخی اور ملن کی تڑپ کا بڑا چنچل اظہار ہوتا تھا، وہ گھونگھٹ میں ہنستی تھی، اسے زندگی کے اس نئے موڑ پر عجیب سی سنسنی اور جوش محسوس ہوتا تھا، فیروزاں اسے ہر بار اس کے ہونے والا شوہر کا نام لے کر چھیڑتی تو اس کے اندر ایک عجیب میٹھی سی لہر چلتی تھی، اس کی آنکھیں خوابوں سے جگمگا اٹھتیں اور اس کے رخسار قندھاری اناروں کی مانند سرخ پڑ جاتے اور اسے لگتا دنیا کا سب سے خوبصورت نام ''حیدر'' تھا۔

مردوں سے اس کا مکمل پردہ تھا، ابٹن اور تیل کی رسمیں بڑی مزے دار اور خوشگوار تھیں، اس کا مہندی کا جوڑا جس دن آیا ساری حویلی میں ہلچل مچ گئی، کیونکہ وہاں ایک مہندی کا ہی نہیں نکاح اور ولیمہ کا بھی جوڑا تھا، انتہائی خوبصورت جھلمل کرتے لباس، نکاح کا جوڑا سونے کے تاروں سے سجایا گیا تھا اور ولیمہ کا جوڑا اس سے بھی زیادہ قیمتی نگینوں سے سجا ہوا تھا ان کی دیدہ زیبی اور چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرنے والی تھی۔

عنایت بی بی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، اس کا سراونچا کر دیا تھا ان کی سہیلی نے، اتنے مان، اتنی چاہت اور اتنے چاؤ سے شگن کا سامان بھیجا تھا کہ سب کو دارین کی خوش قسمتی پر رشک آرہا تھا، مہندی کے روز پیلے ملبوس

میں تیل لگے بالوں کے باوجود اس کی رنگت کی گلابیاں عروج پر تھیں۔

اس کے ہاتھوں میں روایتی انداز میں مہندی لگائی گئی، ہتھیلی کے وسط میں گول تکیہ اور انگلیوں کی پوریں مہندی کے سرخ رنگ سے سج گئیں، بال تیل سے بھرے پڑے تھے، اس کی گود میں ڈھیروں ڈھیر بد (بادام، کاجو، بتاشے، خشک کھجور اور ناریل) ڈالی گئی۔

اگلے روز نکاح تھا، جس کا انتظام حویلی کے بڑے سے صحن اور مردانے میں کیا گیا تھا۔

دولہا والوں کا استقبال بڑے جوش و خروش اور دلی خوشی و آمادگی سے سرخ گلابوں کی پتیاں برسا کر کیا گیا تھا، پھول نچھاور کرنے والی ننھی بچیاں حیران تھیں، ایک نے جلدی جلدی اپنی پلیٹ خالی کی اور بھاگ کر اپنی بڑی بہن کو وہ حیران کن خبر سنائی۔

ساری بارات کے مرد پینٹ کوٹ میں ملبوس تھے، جبکہ ان کے ہاں دولہا بڑا روایتی لباس پہنا کرتا تھا، جو کہ شیروانی اور کلاہ پر مشتمل ہوتا تھا، فوراً ہی اسے "ماڈرن دولہا" کا نام دے کر فیروزاں نے ساری بات دارین کے کانوں میں ڈال دی۔

جواباً وہ سر نیچے کیے ہنستی چلی گئی، نکاح کی تقریب کے بعد طعام کا سلسلہ تھا جو کہ اچھا خاصا طویل اور دلچسپ رہا، سات قسم کے رنگا رنگ کھانے بنائے گئے تھے، ہر دم چوکس اور چوکنے خدمت گاروں نے کہیں کوئی کمی نہ رہنے دی تھی، چونکہ دولہا دولہن کو ساتھ بٹھانے کا کوئی رواج نہ تھا اس لیے سیدھا رخصتی ہی کی گئی، جس میں دارین نے اپنا رو رو کر برا حال کر لیا تھا، یہاں تک امّاں کو اسے جھڑک کر خود سے الگ کرنا پڑا تھا، بڑی سی چادر میں لپٹی وہ گاڑی میں آ بیٹھی، جو کہ جیپ ٹائپ پجارو تھی، اسے چونکہ گاڑیوں کے ماڈلز کا پتہ نہ تھا جبھی وہ اندازہ ہی لگا پائی تھی، اس کے بعد گاڑی چل پڑی اور پتہ نہیں کتنے گھنٹے چلتی رہی، وہ اسی طرح بیٹھی رہی، سر نیچے کیے، کانپتی ٹانگوں اور نمی سے بھرے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ۔

اور پھر قافلہ رک گیا، اسے "شیش محل" لے جایا گیا، جو کہ واقعی ہی میں دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا، قد آدم دروازے لمبی دیواریں، اونچی چھتیں اور چمکتے فانوس، ریشمی پردے، اور دبیز قالینوں سے ڈھکے فرش جن میں پیر دھنس دھنس جاتے تھے، اسے جب ان ساری رسموں سے (جن سے کبھی اسے بڑا پیار تھا) گزرنا پڑا تو کوفت سے

اس کا برا حال ہو گیا۔

مگر شاید اس کے سسرال والوں کو بھی اس کی تھکن کا اندازہ تھا، اس لیے زیادہ وقت صرف کیے بغیر اسے اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

☆.....☆.....☆

قرمزی اور گلابی پھولوں کی حسین روش کے کنارے پر چلتی شہزادی کا عالیشان لبادہ ایک جھاڑی کے کانٹے سے الجھ کر پھٹ گیا، اس کی حسین آنکھیں احساس توہین اور شرمندگی سے پانیوں سے بھر گئیں۔

شہزادی کی آنکھوں میں آنسو! کنیزیں گھبرا کر بادشاہ کو خبر کرنے دوڑ پڑیں، اپنے لباس کو سمیٹتے ہوئے جب شہزادی نے اردگرد دیکھا تو خود کو تنہا پایا، اس کے چہرے پر پریشانی دوڑ گئی، اس نے بمشکل اپنے تر ہوتے چہرے اور خشک گلے کے ساتھ پکارا تھا، کسی بھی مددگار کو، مگر وہاں کوئی آواز نہ تھی۔

دارین تنہا ہے۔

دارین خوفزدہ ہے۔

اسے ڈر لگ رہا ہے۔

مجھے اس کی کانپتی ٹانگیں اور لرزتے ہاتھ نظر آ رہے ہیں، مگر آہ، وہ دیکھو، دیکھو اسے سردی لگ رہی ہے اس کے کپکپاتے اور نیلے پڑتے ہونٹ مجھے نظر آ رہے ہیں، ہاں مجھے سب نظر آ رہا ہے اور اب وہ آ گیا ہے، دارین تنہا ہے اور میں بے بس۔

☆.....☆.....☆

پھولوں سے مہکتا اس کا وسیع و عریض کمرہ کسی طرح بھی کسی بادشاہ کے حرم سرا سے کم نہ تھا، وہی قالینوں سے ڈھکے فرش، قیمتی فانوس، جہازی سائز انتہائی خوبصورت اور پیچیدہ سا ڈیزائن لیے ہوئے سیاہ رنگ کا بیڈ جس پر میرون رنگ کی چادر بچھی تھی، کھڑکیوں کے آگے سایہ اور میرون امتزاج کے بھاری پردے تھے، جس کی وجہ سے بادی النظر میں کمرے کا تاثر انتہائی شاہانہ تھا، البتہ گہرے رنگوں کے باہمی اشتراک سے ماحول میں ایک عجیب سا بوجھل پن محسوس ہو رہا تھا رات گہری ہونے کو تھی جب دروازے سے وہ اندر آ گئے۔

دارین کی نظریں بڑی دیر کی دروازے پہ ٹکی تھیں، جبھی اس نے فوراً نظر دوڑا کر دیکھا سرالبتہ اس کے نیچے ہی تھا، وہ اس وقت بڑے روایتی انداز میں بیٹھی تھی، مہندی، زیورات اور انگوٹھیوں سے آراستہ ہاتھوں کو گود میں دھرے اس کے چہرے پر ایک خوشنما گھونگھٹ تھا، اسکی نظریں اپنے شوہر کے قدموں کی طرف تھیں جو کہ اس کی طرف پیش قدمی کرنے کی بجائے کسی اور طرف مڑ گئے، اس کے اندر عجیب سی بے چینی در آئی، کچھ دیر بعد اس نے ایک نرم، ہموار اور متوازن آواز سنی۔

''دارین! اس طرف لباس تبدیل کرنے کا کمرہ ہے اور اس کے ساتھ ہی واش روم ہے جاؤ ذرا ہلکا پھلکا ہو کر آؤ۔'' اسے سمجھ نہیں آئی اس آواز میں تحکم زیادہ تھا یا غرور؟ مگر وہ خود کو سمیٹ کر اٹھ گئی۔

وہ بے چارہ سا گھونگھٹ اب بھی اس کے ماتھے اور آنکھوں کو ڈھانپے ہوئے تھا، اس کو آسانی سے اپنا مطلوبہ لباس مل گیا، آئینے کے آگے کھڑے ہو کر اس نے اپنا سنگھار صاف کیا سب زیورات اور گہنے اتارے اور نہانے کے بعد بالوں کو تولیے سے خشک کر کے پشت پر ڈال دیا، دوبارہ اپنا چہرہ آئینے میں دیکھتے ہوئے اسے خاصا اچھا لگا، صاف شفاف اور دھلا ہوا چہرہ اس کا اپنا چہرہ، اس نے اپنے آنچل کو سر پر ڈالا، فضا میں خنکی تھی، یہ اوائل نومبر کے دن تھے، وہ واپس اپنے کمرے میں چلی آئی، دروازہ کھولتے ہوئے اس کی نظریں جھکی تھیں، دوسری طرف فوراً اس کی موجودگی کو نوٹس کیا گیا تھا۔

''یہاں آؤ۔'' انہوں نے کہا، وہ اسی طرح جھکی نظروں سے بیڈ کے پاس چلی آئی۔

''بیٹھ جاؤ۔'' اگلا حکم ہوا اس نے عمل کیا۔

بڑی آہستگی سے انہوں نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اونچا کیا، اس کی نظریں اٹھیں اور ان کی نظروں سے مل گئیں اور پھر جم گئیں، اٹک گئیں، الجھ گئیں، واپس نہ آسکیں، وہ انسان نہیں تھا، وہ آدم زاد تو کسی صورت نہ ہو سکتا تھا، وہ تو چاند نگر کا شہزادہ تھا۔

نرم اور سنہرے بالوں، چمکدار سنہری آنکھیں اور گلابی لبوں کے ساتھ اس کی رنگت دودھ اور گلابوں کو ملا کر بنائی گئی تھی شاید، دارین کی سانس کہیں اندر ہی رک گئی تھی، کیسا شاندار سا انسان تھا وہ، وہ اس کی محویت دیکھ کر ذرا سا مسکرایا تھا، دارین کا طلسم ٹوٹا تھا اسکی نظریں جھک گئیں۔

''کیسی ہو؟'' اس بار لہجے میں ایک خاص نرمی تھی، اس کے ہاتھ درین کے گال سہلا رہے تھے جو کہ سرخ ہو رہے تھے جیسے ان کے نیچے موی شمعیں جل رہی ہوں۔

''میں ٹھیک.....'' وہ آہستہ آواز میں بولی تھی۔

''ہنس کر دکھاؤ ناں۔'' بڑا عجیب حکم تھا یا شاید فرمائش، اس نے بے ساختہ سر اٹھا کر انہیں دیکھا، وہ بھی اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ ''مسکراؤ ناں۔'' انہوں نے اصرار کیا، وہ بے ساختہ مسکرائی تھی، بہت ہلکا سا، یوں کے اس کے ہموار چمکتے دانت بہت کھل اٹھے اور اس کے گالوں میں پڑنے والے چاہ زنخداں حیدر کو سحر زدہ کر گئے، ان کی نظریں اس کے گالوں میں پڑتے ان گڑھوں پر جمی رہ گئیں، انہوں نے بے اختیار اسکے گال کے گڑھے کو چھوا۔

''لاجواب۔'' توصیفی انداز، درین کپکپا گئی۔

یہ اتنا اندھیرا کیوں ہے؟

روشنی کیوں کھو گئی ہے؟

روشنی کرو، تاریکی سے دل ڈرتا ہے!

دارین کو اس کے حصے کا اجالا چاہیے!

نہیں.....نہیں یہ مت کرو، دیکھو اسے درد مت دو!

وہ رو رہی ہے.....دارین.....!

☆.....☆.....☆

منظر بدل رہا تھا، وہ اردگرد دیکھتی حیران سی تھی، یکلخت قرمزی اور بنفشی پھولوں کا رنگ سیاہ پڑتا گیا، ان کی شاخیں مرجھا کر جھک گئیں۔

شہزادی نے خوفزدہ ہوتے ہوئے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا جہاں پھیلی ست رنگی دھنک اب غائب ہوتی جا رہی تھی اور اس کی جگہ اب سیاہ بادل وہاں گھیرا ڈال رہے تھے، یہ کیا ہو رہا تھا؟ اسکے گرد پھیلی خوشی و خوشنمائی اس سے دور ہو چکی تھی، اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا، اس کے چہرے پر عجیب سا ڈر چھانے لگا۔

☆.....☆.....☆

اگلی صبح روایتی طور پر اسکے گھر سے ناشتہ آیا تھا، جس میں کئی قسم کے مرغن اور روایتی کھانے تھے، دارین کو خوبصورت لباس میں ملبوس کیا گیا، اس کے خوبصورت اور حسین بال ایک جوڑے کی شکل میں باندھے گئے تھے اور جب اسے اس کی پسند کے کھانے کی میز پر لے جایا گیا تو وہ چٹ پٹے کھانوں کی بڑی شوقین تھی، دونوالوں سے زیادہ کچھ کھا نہ سکی، اس کی ہمت نہ رہی تھی، سامنے بیٹھا شخص اس قدر اثر پذیر تھا کہ وہ کچھ بھی کھانے کے اہل نہ رہی تھی۔

ولیمہ کی تقریب بلاشبہ مدتوں یاد رہنے والی تقریب تھی، وہ ایک شاندار اور بہت خوبصورت جوڑا تھا، جس کے لیے ہر آنکھ میں میں ستائش تھی۔

اسکے میکے جب اسے لے جایا گیا تو ہر طرف دولہا کی دھوم مچ گئی، فیروزاں جھٹ سے اس کے پاس گھس آئی وہ لمحوں میں سب جان لینا چاہتی تھی، مگر دارین کا عجیب رویہ اور خاموشی اسے حیرت میں ڈال گئی۔ اس کے ڈھیروں سوالوں کا جواب دارین نے ایک ہلکی مسکراہٹ کے سوا کچھ نہ دیا تھا، وہ الجھی سی وہاں سے اٹھ آئی تھی، دل میں قدرے ناراض بھی کہ کیسے اس کی یہ عزیز ترین سکھی اتنا پیارا دولہا پانے کے بعد بدل گئی تھی، مغرور ہوگئی تھی کہ کسی بھی بات کا صحیح اور تسلی آمیز جواب دینے کی بجائے ایک مسکراہٹ کے ساتھ اسے ٹالتی رہی تھی۔

واپسی پر رات کو جب رسموں کے بعد ان دونوں کو کمرے میں لے جایا گیا تو آج بھی انہوں نے اسے کل والا حکم دیا تھا اور جب وہ اپنے بھاری لباس اور زیورات سے چھٹکارا پا کر نہا کر آئی تو انہوں نے اسے پاس بٹھالیا تھا۔

"مجھے بناؤ سنگھار پسند نہیں ہے دارین! جب میں موجود ہوں تو تم مجھے ایسے ہی نظر آؤ، کسی بھی قسم کے آرائش و آلائش سے مبرا۔" انہوں نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا، دارین نے بنا کچھ بولے سر ہلا دیا۔

اگلے دن اسی شاہی رعب و دبدبے اور شان و شوکت سے وہ واپس آ گئی۔ اس کے میکے سے سسرال کا سفر چھ گھنٹوں پر محیط تھا اور آج تو یہ چھ گھنٹے چھ سالوں کے لیے طویل ہو گئے تھے۔

آنے سے پہلے عنایت بی بی نے اسے بہت دیر پاس بٹھا کر سمجھایا تھا، زمانے کی اونچ نیچ سسرال میں ہونے والے مسائل، ممکنہ اتار چڑھاؤ اور اس کے ساتھ صبر و برداشت کا سبق، وہ خاموشی سے سر جھکائے سنتی رہی۔

ماں اسے سمجھوتے کا سبق دے رہی تھی یہ سمجھے بغیر کہ وہ تو انہیں بتائے بغیر سمجھوتے کی سیڑھی چڑھ چکی تھی، وہ اسے سمجھاتی رہی تھیں کہ اب اس نے اپنا بچپنا چھوڑ کر ذمہ داری اٹھانی ہے اور اگر کوئی بھی بات ہوئی تو لوگ ان کی تربیت کو فوراً قصوروار ٹھہرائیں گے کہ چونکہ باپ سر پہ نہیں تھا اس لیے ماں صحیح تربیت نہ کر سکی، اس کا دل تڑپ گیا۔

''جن بیٹیوں کے باپ سر پہ نہیں ہوتے، ان کی ڈولی نہیں جنازے ہی اٹھا کرتے ہیں، آپ فکر کیوں کرتی ہیں اماں؟ آپ کو کبھی بھی میری شکایت نہیں ملے گی، میری دعا ہے اماں آپ کے پاس میرے حوالے سے کبھی کوئی خبر نہ پہنچے، سوائے اس کے کہ وارین مر گئی۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

اس کے سسرال میں اسے تین چیزیں تحفے میں ملی تھیں، ایک معذور ساس، دوسری شیش محل کی ذمہ داری اور حکم دینے والا آفسر۔

اس کی ساس زبیدہ خانم ایک حادثے میں اپنی دونوں ٹانگیں کھو چکی تھیں، اور پچھلے اٹھارہ سالوں سے وہ وہیل چیئر پر تھیں، حیدر چوہدری ان کے اکلوتے بیٹے تھے، وہ نسلوں سے زمین دار لوگ تھے مگر اس کے باوجود حیدر چوہدری نے اپنے لیے افسری پسند کی تھی، اگرچہ ان کے بابا فرقان چوہدری اپنی زمینوں کو سنبھال رہے تھے اور ایسا نہیں تھا کہ حیدر چوہدری کو اپنے آبائی پیشے سے کوئی نفرت تھی یا وہ اس میں دلچسپی نہیں لیتے تھے، بلکہ وہ اپنے بابا کی ہر فیصلہ لینے میں مکمل حساب ہوتا تھا اور جب بھی وہ چھٹی پر آتے تھے دونوں باپ بیٹوں کے درمیان گزشتہ مہینوں کے کھاتے کھل جاتے تھے۔

''شیش محل'' کی تعمیر خالصتاً روایتی اور پرانے طرز کی تھی، بڑے بڑے عالیشان کمرے، پیچیدہ کاری سے سجے، ستون، برآمدے، دالان، پائیں باغ، مطبخ خانہ، نماز کا کمرہ، مہمان خانہ اور ملازمین کے لیے منسلکہ چھوٹے کمرے۔ بنیادی طور پر یہاں دو خاندان آباد تھے، زبیدہ خانم اور فردوس خانم جو کہ ان کی ہمشیرہ تھیں، وہ اپنی دو بیٹیوں کے ہمراہ رہتی تھیں، ان کے شوہر وفات پا چکے تھے۔

نورینہ اور شبینہ دونوں جوان اور غیر شادی شدہ تھیں، اس لیے اس محل کا انتظام ان دونوں کے ہاتھ میں تھا،

زبیدہ خانم کا کردار گھر میں اتنا غیر اہم تھا کہ وہ اپنی ایک کل وقتی ملازمہ عیشاں کے ساتھ اپنے کمرے تک محدود رہتی تھیں۔

جب حیدر نے اس کو ذمہ داریاں سونپی تھیں تب ان کا لہجہ دوٹوک، کرخت اور کسی بھی قسم کا لچک سے عاری تھا۔ ''اس گھر کا انتظام خواتین ہی چلاتی آئی ہیں اب تک، اس لیے اس میں تمہارا حصہ تمہیں سمجھا دیا جائے گا، عملی اور حقیقی طور پر تمہاری ایک ہی ذمہ داری ہے اس گھر میں اور وہ ہیں میری ماں، اب تمہیں ماں کی دیکھ بھال کرنا ہے دارین، عشیاں کو چھٹی تو نہیں دی جائے گی مگر بہر حال اصل ذمہ داری اب تمہارے سپرد ہے، مجھے ماں سے بہت پیار ہے دارین، مگر مشکل یہ ہے کہ میں اپنی نوکری کی وجہ سے یہاں ان کے قریب نہیں رہ سکتا، مگر میں ان کے معاملے میں کسی قسم کی کوتاہی برداشت نہیں کروں گا۔''

دارین کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ اسی طرح سر ہلا کر ان کی بات سمجھ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

اور پھر شہزادی نے سب سے حیران کن نظارہ دیکھا، اس کے دیکھتے ہی دیکھتے منظر یک لخت بدل گیا، ان سیاہ بادلوں کے جھنڈ سے ایک سفید مشکی گھوڑا نمودار ہوا جس کے پیروں پہ حسین جھالریں تھیں اور اس پر ایک شہزادہ سوار تھا، سنہرے تاج اور شاہی لباس میں اس شہزادے کی سج دھج دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، شہزادی دم بخود اس طرف دیکھ رہی تھی، گھوڑا لحہ بہ لحہ اس کے نزدیک آتا گیا۔

☆.....☆.....☆

اس نے صحن کے وسط میں کھڑے ہو کر اطراف میں نظر دوڑائی تھی، ایک طرف بڑی سی چادر بچھی تھی، جس پر اچار کی پھانکیں خشک ہونے کے لیے رکھی گئی تھیں، سفید بے داغ چادر پر سبز اور کچے پیلے رنگ کے آم بڑے خوشنما دکھائی دیتے تھے، اس نے گھٹنوں کے بل جھک کر ایک پھانک اٹھائی، اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر واپس رکھ دی، ابھی مکمل طور پر خشک ہونے میں مزید ایک دن باقی تھا۔

اس نے واپسی کے لیے اٹھتے اپنے گھٹنوں سے نادیدہ گرد جھاڑی اور سست روی سے عمارت کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی، زبیدہ خانم کی ظہر کی نماز کا وقت ہو رہا تھا اور اس نے انہیں وضو کروانا تھا، اس نے قدم ان

کے کمرے کی طرف بڑھا دیئے، وہ بیڈ پہ نیم دراز تھیں اور عشیاں ان کے بازو دبا رہی تھی، دارین کو دیکھ کر وہ ادب سے پیچھے ہٹ گئی۔

''آؤ بہو خانم۔'' اسکو دیکھ کر زبیدہ خانم نے مسکرا کر کہا تھا۔

''آپ کی نماز کا وقت ہو رہا ہے ماں۔''

اس نے آگے بڑھ کر ان کی وہیل چیئر آگے کی اور انہیں اس پر بٹھانے لگی، عشیاں نے بھی اس کی مدد کی تھی، وہ آہستہ آہستہ انہیں لے کر غسل خانے کی طرف بڑھ گئی، اپنے ہاتھوں سے جب وہ انہیں وضو کروا رہی تھی تو وہ اس کا چہرہ غور سے دیکھ رہی تھیں، کانوں میں ہلکی پھلکی سونے کی بالیاں، گردن کے گرد زنجیر جس میں ایک خوبصورت اور پیچیدہ ڈیزائن کا لاکٹ جھول رہا تھا، جس کے اندر دو خوشنما پھول باہم ملے ہوئے تھے، دونوں کلائیوں میں سونے کے کنگن پہنے ہوئے تھے، یہ زیورات اس نے ہمیشہ پہنے ہوتے تھے، یہاں تک کہ سوتے وقت بھی اور زبیدہ خانم کو ان کی آواز بہت اچھی لگتی تھی، وہ جب بھی ان کے کہیں آس پاس ہوتی اس کے کنگن کی کھنکھناہٹ انہیں اس کی موجودگی کا پتہ دیتی تھیں اور جب جب وہ اسے اپنے گرد دیکھتیں، نہال سی ہو جائیں وہ ان کے اکلوتے بیٹے ان کے حیدر کی بیوی تھی اور اس شادی کے لیے انہوں نے کتنی مشکل سے اسے آمادہ کیا تھا یہ وہی جانتی تھیں وہ سخت خفا تھا اور شاید کسی حد تک اس کی خفگی جائز بھی تھی، حیدر کا کہنا تھا کہ وہ بہت کم عمر تھی مگر انہوں نے اس کی ایک نہیں چلنے دی اور اسے منا کر دم لیا تھا اور اب فخر ہوتا تھا، وہ بہت سمجھدار اور باشعور لڑکی تھی، غیر سنجیدگی اور شوخی تو اس میں نام کو نہ تھی، ہر کام کو مقررہ وقت پر کرنا اور پھر ہمیشہ ان سے اجازت لے کر نا، اس کی عادت تھی۔

اس کے آنے سے پہلے وہ ایک کمرے تک محدود تھیں ہاں شام کے وقت ذرا دیر تک کے لیے عشیاں کے ساتھ باہر آیا کرتی تھیں، مگر دارین کے آنے کے بعد ان کے اوقات کار میں فرق پڑ گیا تھا، وہ انہیں ہر معاملے میں اولیت دیتی تھی، کھانے پکانے کی ترکیبیں ان سے پوچھتی اور عین ان کے مطابق کھانا بناتی، گھر کے امور میں اس کی دلچسپی دیکھنے لائق ہوا کرتی تھی اور انہیں کبھی محسوس نہ ہوا تھا کہ دارین کو درحقیقت کچھ بھی کرنا نہ آتا تھا۔

اس نے اپنی یہ لاعلمی اور گھر کے کاموں سے دوری کو اپنے شوق اور لگن کے پردے میں اس طرح چھپایا تھا

کہ ان جیسی جہاندیدہ خاتون بھی نہیں جان پائیں تھیں، دارین نے ان کے اوقات کار کو بڑی خوبی اور خوبصورتی سے بدلا تھا، اس نے دوبارہ انہیں ایک بند کمرے سے باہر نکال کر گھر میں ان کا کھویا ہوا یا چاک و چوبند کردار بحال کیا تھا۔

اس نے ہر کام میں انہیں اولیت دے کر اپنا مقام حاصل تو کیا ہی تھا مگر انہیں بھی مصروف کر دیا تھا، غرض یہ کہ انہیں اپنی بہو سے کوئی شکایت نہ تھی، وہ اسے سجا سنورا دیکھ کر خوش ہوتی تھیں اور اسے ''بہو خانم'' کہنے کے باوجود اسے اپنی بیٹی تسلیم کرتی تھیں۔

☆.....☆.....☆

رات کے قریباً سات بجے کا وقت تھا آج ہی اس نے زبیدہ خانم کے حکم پر سردیوں میں استعمال ہونے والے لحافوں کو دھوپ لگوائی تھی، شنیل اور شنگھائی کے خوبصورت اور پھولدار لحاف ملازمہ کے ساتھ مل کر سمیٹتے اس کی کمر دوہری ہو گئی تھی، مگر اب موسم بدل رہا تھا، سو ان کی ضرورت تھی۔

مگر سونے سے پہلے روزانہ کے معمول کے مطابق وہ ان کے پاؤں دبانے کے لیے آموجود ہوتی تھی، جبھی ٹیلی فون بجنے لگا، یہ پی ٹی سی ایل تھا جو کہ زبیدہ خانم کے کمرے میں لگا تھا اور ان کے سرہانے رکھا رہتا تھا، انہوں نے فون اٹھالیا اور آواز سنتے ہی ان کا چہرہ کھل اٹھا، حیدر کا فون تھا۔ اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے، اسے پتا تھا کہ اب یہ بات لمبی چلے گی اور زبیدہ خانم کو ہمیشہ تنہائی میں حیدر کا فون سننے کی عادت تھی، مگر انہوں نے آج فون پہلے دارین کی طرف بڑھا دیا۔

''لو پہلے تم بات کرو۔'' دارین نے سست ہاتھوں سے فون تھام لیا۔

''السلام علیکم!'' اس کی آواز آہستہ تھی۔

''وعلیکم السلام کیسی ہو؟'' بہت رسمی سا لہجہ تھا۔

''ٹھیک ہوں۔ آپ؟'' وہ بدقت تین لفظ بول پائی تھی۔

''میں بھی ٹھیک ہوں، ماں کیسی ہیں؟'' وہ فوراً سے ان کے متعلق سوال کر رہے تھے۔

''وہ بالکل ٹھیک ہیں۔''

''ان کا خیال رکھتی ہوناں؟'' بارعب آواز۔

''جی کوشش تو پوری کرتی ہوں۔'' گڑبڑایا ہوا جواب۔

''کوشش نہیں چاہیے مجھے عمل چاہیے۔'' وہ سرد مہری سے بولے تھے، دارین کے ہونٹ کچھ کہنے کی جدوجہد میں کپکپا کر رہ گئے۔

''ماں کو فون دو۔'' انہوں نے کہا تو نا معلوم کیوں اسے لگا کہ ان کے انداز میں ناگواری تھی، اس نے فون ان کی طرف بڑھایا اور اٹھ گئی، ساتھ بجے کے بعد رواج کے مطابق سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے تھے، اپنے کمرے میں آ کر اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔

شیش محل کے مالک کا کمرہ ویسا ہی شاندار اور پراسرار تھا، وہ دروازہ بند کر کے بستر پر آ کر بیٹھ گئی۔

اس کے چہرے پر عجیب سی لاتعلقی اور گہری سوچ کے آثار تھے، اس نے دونوں ہاتھوں سے بالوں کو سمیٹ کر جوڑے کی شکل میں باندھا اور اٹھ کر ایک طرف بڑھ گئی، کچھ دیر بعد جب واپس آئی تو اسکے ہاتھ میں کچھ صفحات اور ایک ڈائری تھی۔

اس نے ایک صاف صفحہ ڈائری کے اوپر رکھ کر ہاتھ میں کچی پنسل پکڑ لی اور پھر اس کی مخروطی انگلیاں چلنے لگیں اور جب اس نے ایک گھنٹے کے بعد سر اٹھایا تو اس کے چہرے پر تھکن رقم تھی۔ اس نے ڈائری کھولی اور کچھ لکھنا شروع کر دیا، کم و بیش چار صفحات لکھنے کے بعد اس نے وہ صفحہ ڈائری کے نیچے دبایا اور دونوں چیزوں کو بیڈ پر رکھ کر خود غسل لینے کے لیے چلی گئی، ڈائری کے نیچے دیے کاغذ پر سے دو ناراض آنکھیں جھانک رہی تھیں ان آنکھوں سے اوپر اور فراغ پیشانی پر بڑی نمایاں شکن تھی اور یہ ناگواری کے تاثر سے لبریز چہرہ حیدر چوہدری کا تھا۔

☆.....☆.....☆

گھوڑے پر سوار شہزادے کے سر پر موجود اس کے سنہرے تاج سے پھوٹتی کرنیں شہزادی کو مسحور کر رہی تھیں، وہ کسی مقناطیسی طاقت کے زیر اثر اس کی طرف بڑھتی چلی گئی، اردگرد کے مناظر اس کے ذہن سے محو ہوتے گئے، اسے احساس بھی نہ ہوا کب اس نے ہاتھ شہزادے کے ہاتھ میں دے دیا۔

☆.....☆.....☆

اس نے دودھ پتی کا کپ ماں کے آگے رکھا تو گیلے بال آگے جھک آئے تھے، انہوں نے اس وقت تو اسے کچھ نہ کہا تھا مگر رات جب وہ انہیں دبانے کے لیے آئی تو وہ اسے ٹوک گئی تھیں۔

''بہو خانم۔'' انہوں نے کہا۔

''جی ماں جی۔'' وہ رک کر ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

''لڑکیوں کے کھلے بال مجھے پسند نہیں، آج کے بعد جب بھی نہاؤ بال اپنے کمرے سے ہی باندھ کر باہر آنا۔'' انہوں نے دو جملوں میں بات ختم کر دی تھی۔

اس نے خاموشی سے ان کی بات سنی اور تابعداری سے سر ہلا دیا تھا، اس کے بعد انہوں نے کبھی اس کے بال گیلے اور کھلے نہ دیکھے تھے، اس نے دن میں نہانا ہی چھوڑ دیا تھا، رات سونے سے پہلے وہ نہاتی اور حیدر کی صورت آنکھوں میں سموئے سو جاتی، بہت دفعہ اسے عجیب لگتا اور بہت دفعہ جھنجھلاہٹ بھی ہوتی تھی جب کسی صبح آنکھ کھلنے پر وہ انہیں اپنے ساتھ نہیں دیکھتی تھی، وہ ''بامراد'' ہو کر بھی ''بے مراد'' تھی۔ اسنے رات کو کھانا بناتے ہوئے ایک نظر صحن میں دوڑائی جہاں سے بھولا بسرا راہی تا حال لاپتہ تھا۔

ماں نے کہا تھا آج وہ آ رہے تھے، بہت خاص تیاریاں کی جا رہی تھیں، ان کی پسند کے کھانے بنائے گئے تھے، دارین انہیں انتظامات کو آخری بار دیکھنے آئی تھی۔

واپس جانے کے لیے قدم اٹھاتے ہوئے اس نے ماں کے کمرے کی طرف دیکھا جہاں عیشاں موجود تھی اور مطمئن سی ہو کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی، کمرے میں موجود آئینے کے سامنے آ گئی، ماں کی خواہش تھی کہ آج وہ بہت سا ہار سنگھار کرے، وجہ صاف ظاہر تھی، آج شادی کے بعد وہ پہلی بار آ رہے تھے، اسی لیے اس نے دل بھر کر سنگھار کیا تھا وجہ صرف ان کی خواہش کا احترام تھا ورنہ وہ آگاہ تھی کہ وہ یہ سارا سج دھج دیکھنے میں کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے۔

اس نے بری کا ایک خوبصورت کامدار جوڑا پہنا تھا اور ہونٹوں پر شوخ سرخ لپ اسٹک لگائی تھی، جس نے اس کے حسن کو دو آتشہ کر دیا تھا، بال جوڑے کی شکل میں بندھے تھے اور اس کی صراحی دار گردن کی چمک مزید دہک اٹھی تھی، اس نے انگلیوں پر کچھ گنا۔

''تین ماہ سترہ دن اور نو گھنٹے۔'' اسے جھٹکا لگا وہ اتنے سارے دنوں بعد آ رہے تھے اور وہ سارے دن اس نے کیسے گزارے تھے؟ اس نے یاد کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

اسے کچھ دیر بعد ماں کے کمرے سے بلاوا آ گیا اور اس وقت شام ڈھل رہی تھی، جب اس نے اندر قدم رکھا تھا، وہ بالکل سامنے تھے، براؤن ٹو پیس پہنے کرسی ان کے قریب رکھے بیٹھے تھے، چہرے سے سفر کی تھکان واضح تھی، ماں کی آنکھوں میں خوشی بھری نمی تھی اور حسب توقع ان سے گلے شکوے کر رہی تھیں کہ وہ اتنے دنوں بعد آئے تھے اور وہ تابعداری سے سر جھکائے سن رہے تھے، جب اس نے سلام کیا تو انہوں نے انتہائی سرسری نظر سے اسے دیکھ کر رسمی جواب دیا اور پھر سے ماں کی طرف متوجہ ہو گئے ماں نے دارین کو کھانا لگانے کا کہا تھا، وہ سر ہلا کر واپس مڑ گئی، جب میز پر کھانا چنا گیا تو وہ ماں کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھے تھے، جو کہ نہایت اصرار سے ان کی پلیٹ میں مختلف کھانے ڈالتے ہوئے بڑے فخر سے انہیں بتا رہی تھیں کہ یہ انواع واقسام کے کھانے ان کے لیے ان کی بہو خانم نے بنائے تھے اور وہ بس سر ہلاتے ہوئے ہلکا پھلکا لے رہے تھے، وہ اپنی غذاء کے معاملے میں از حد محتاط تھے۔

اور دارین کی پلیٹ میں ابلی ہوئی سبزیاں تھیں جن میں کالی مرچ کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا اور آدھی روٹی اس کے ہاتھ میں تھی، جس میں سے بمشکل چار نوالے لیے گئے تھے، یہ سلسلہ جلد ہی اختتام پذیر ہو گیا کیونکہ حیدر کو آرام کرنا تھا، اس لیے دارین دسترخوان اٹھوانے میں لگ گئی، بچے ہوئے کھانے کو محفوظ کر کے اس نے ملازمہ کو برتن دھونے پہ لگایا اور خود سبز چائے بنا کر ماں کے کمرے کی طرف چل پڑی۔

منظر اس بار پہلے سے زیادہ مختلف تھا، انہوں نے لباس تبدیل کر لیا تھا اب وہ نسبتاً ایک آرام دہ شلوار کرتہ میں ملبوس تھے اور یہ دیکھ کر دارین کو بے حد حیرت ہوئی کہ وہ ماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹے ہوئے تھے، اس نے تپائی پر ہاتھ میں پکڑی ٹرے رکھی اور اسی خاموشی سے واپس مڑ گئی، یہاں اسکی ضرورت نہیں تھی۔

ماں کو اپنے اور حیدر کے درمیان کوئی دوسرا پسند نہیں تھا، وہ تو ان کی فون کال میں کسی دوسرے کی موجودگی برداشت نہیں کرتی تھیں جبکہ اب تو وہ خود موجود تھے۔

دارین نے قدم اپنے کمرے کی طرف بڑھا دیئے، ایک نظر سارے کو دیکھا ہر چیز اپنی جگہ موجود تھی، صاف

ستھری اور مکمل، اس نے ان کا اتارا ہوا لباس دیکھا اور نہ جانے کیا سوچ کر اس نے سفید شرٹ الگ کر لی۔

باقی لباس دھلنے کے لیے رکھ کر اس نے اپنے آپ کو آخری بار آئینے میں دیکھا، اس کی لپ اسٹک کافی مدھم پڑ چکی تھی، وہ مزید کوئی تبدیلی کیے بغیر بیڈ کی طرف چلی آئی، بے تحاشا تھکن نے اسے نڈھال کیا ہوا تھا، وہ بیڈ پر نیم دراز ہو گئی، تھوڑی دیر بعد ہی اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں موجود روشنی مدھم ہو چکی تھی، اسے یکلخت یاد آیا کہ وہ تنہا نہیں تھی، اس نے گردن موڑ کر دیکھا، بیڈ کے دوسرے سرے پر وہ ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور ان کے ہاتھ میں جلتا ہوا سگریٹ تھا، اسے جاگتے دیکھ کر انہوں نے گردن موڑ کر اسے دیکھا، ان کی نظریں نہیں تھیں گویا کوئی کٹہرا تھا جس میں وہ جواب دہ تھی، اسے یکدم اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا، اس نے یقیناً غلط کیا تھا، اسے ان کا انتظار کرنا چاہیے تھا، اسے سونا نہیں چاہیے تھا، وہ تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''وہ مجھے پتہ نہیں چلا، میں منہ دھو کر آتی ہوں۔'' وہ حواس باختگی سے بولی تھی، انہوں نے جواب دینے کی بجائے ہلکا سا سر کر خم دے کر گویا اجازت دے دی، وہ دوپٹہ سنبھالتی ہوئی آگے بڑھ گئی، واش بیسن کے آگے کھڑے ہو کر اس نے پے در پے کئی چھپاکے منہ پر مارے پھر ٹشو سے لپ اسٹک صاف کرتے ہوئے باہر نکل آئی، اس نے دوپٹہ سر پر ٹکایا اور ان کے پاس چلی آئی، انہوں نے اسے پاس بیٹھتے دیکھ کر سگریٹ راکھ دان میں مسل دیا۔

آج بھی پہلے دن کی طرح اس کی نظریں جھکی تھیں، حیدر نے دیکھا اس کے لبوں پر مدھم ہوتی سرخی تھی، انہوں نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھتے ہوئے اسے اوپر اٹھا دیا، اس کی پلکیں ہلکا سا لرزیں اور گالوں پہ جھک گئیں۔

''دارین!'' انہوں نے بہت مدھم آواز میں اسے پکارا تھا۔

''جی!'' اس کی آواز کسی غار سے نکلی تھی۔ ''مسکرا کر دکھاؤ ناں۔'' انہوں نے یوں فرمائش کی جیسے وہ چابی سے چلنے والی گڑیا ہو، دارین کے ہونٹ مسکرانے والے انداز میں کھچ گئے مگر اس کی آنکھوں کے پیچھے پانیوں کے کئی سیلاب تھے، جو باندھے گئے بند کے ہاتھوں مجبور تھے اور جن سے شیش محل کا مالک بالکل بے خبر تھا اور اسی

بے خبری میں انہوں نے اسے قریب کرلیا تھا اور اس کے کانوں میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ماں تم سے بہت خوش ہیں۔'' وہ کہہ رہے تھے اور دارین کا دل چاہا وہ چیخ کر پوچھے۔

''اور آپ؟ کیا آپ خوش ہیں؟'' مگر اس نے نوک زبان پہ آنے سے پہلے ہی لفظوں کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

اور اس وقت وہ تین ماہ سترہ دن کے بعد پھر سے اس شہزادے کے بازوؤں میں تھی، بالکل کسی گڑیا کی مانند جو کسی ضدی بچے کے ہاتھ لگ جائے اور وہ اس سے کھیلتے کھیلتے اسے توڑ پھوڑ دے اور اگلی صبح جبکہ وہ جاگ رہی تھی اُس وقت تہجد کی اذان ہو رہی تھی اور اسے علم تھا کہ اسے ماں کو وضو کروانا تھا مگر وہ اسی طرح آنکھیں بند کیے پڑی رہی۔

کیا تم جانتے ہو؟

میں تمہارے قریب ہوں اور!!!

پھر بھی بدنصیب ہوں!!!!

☆.....☆.....☆

اسے ان سے بہت سی باتیں کرنا تھیں، اسے انہیں بتانا تھا کہ اس نے اتنے سارے دنوں میں انہیں کتنا یاد کیا تھا، اسے انہیں اپنے ویران دن اور بے خواب راتوں کے درد بتانے تھے، اسے ان کے لیے بہت سا ہنسنا تھا اور اسے ان کو دکھانا تھا کہ بھلے ہی اس کا ہاتھ کئی بار جلا تھا مگر یہ سب کھانے اس نے کتنے شوق سے ان کے لیے بنائے تھے، اسے انہیں بتانا تھا کہ وہ قطعاً بھی کم گو نہیں ہے وہ کتنی شوخ چنچل اور کتنی زندہ دل ہے۔

ہاں ابھی تو اس نے ان سے بہت سی باتیں کرنا تھیں جب اسے پتا چلا کہ وہ اگلی صبح واپس جا رہے تھے تو اس کے اندر اندھیرے اتر آئے، خاموشیوں کا پہرہ کچھ اور بھی گھنگھور ہو گیا تھا۔

ناشتے کی میز پر اس کے لب کچھ مزید سختی سے بھینچے ہوئے تھے، ماں ان سے باتیں کرنے میں مصروف تھیں اور اس نے رات کی طرح اب بھی چند نوالے لیے اور خود کو کچن میں مصروف کرلیا۔

دوپہر کا وقت تھا جب وہ کہیں باہر سے آئے تھے، ہمیشہ کی طرح یہاں بھی بے حد مصروف ہوتے تھے، گاؤں کے افراد کا ملنے کے لے تانتا بندھا رہتا تھا، پھر انہیں بابا کے ساتھ زمینوں کے معاملات بھی دیکھنے ہوتے

تھے۔ وہ ان کے لیے چائے لے کر آئی تھی جب وہ بیڈ پر نیم دراز سگریٹ سلگا کر بیٹھے تھے، وہ عجیب سے شش و پنج میں کھڑی انہیں دیکھنے لگی پھر کچھ جھجک کر نظریں جھکا کر ہونٹ کاٹنے لگی، انہوں نے اسے کھڑے دیکھا تو ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا وہ شکر کرتی بیٹھ گئی۔

''وہ مجھے بات کرنا تھی۔'' اس کے دھیمے لہجے میں جانے کیا تھا کہ وہ چونک سے گئے تھے۔

''کون سی بات؟'' انہوں نے ہاتھ میں پکڑے موبائل پہ نظر جمائے کہا تھا، اسے نظر نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کر رہے تھے۔

''آپ جا رہے ہیں؟'' اس نے بہت ہمت اور حوصلے سے بالآخر پوچھ ہی لیا تھا، انہوں نے جواباً نظر اٹھا کر اسے یوں دیکھا جیسے اس کے سوال کی سمجھ نہ آئی ہو۔

''آپ اتنی جلدی کیوں جا رہے ہیں؟ ابھی مت جائیں نا، مجھے آپ کی بہت یاد آتی ہے۔'' وہ بھرائے ہوئے لہجے میں کہتی آخر پہ رو ہی پڑی، حیدر یک ٹک اسے دیکھ رہے تھے ان کے چہرے پر شدید حیرت ثبت تھی، دارین کو یکدم سے اپنی غلطی کا احساس ہوا، شاید اس نے غلط بات کہہ دی تھی، یا غلط موقع پر کہہ دی تھی، یا شاید غلط آدمی سے کہہ دی تھی، اسے اپنی غلطی کا احساس تو ہو چکا تھا مگر غلطی سمجھ نہیں آرہی تھی۔

مستزاد حیدر کے چہرے کے تاثرات سے اسے اندازہ ہوا کہ تیر کمان سے نکل چکا تھا، اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا موبائل ایک طرف رکھا، سگریٹ کی راکھ کو راکھ دان میں جھٹکا اور ایک گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑ دیا۔

دارین کے اعصاب تن گئے اس نے ساکت نظروں سے یہ سارا واقعہ دیکھا، ان کا یہ پرسکون انداز اس کے لیے بڑا عجیب تھا، انہیں کوئی ردعمل دینا چاہیے تھا، مگر وہ کسی بھی قسم کے تغیر سے مبرا تھے، انہوں نے دایاں ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا، دارین نے چونک کر انہیں دیکھا اس گرفت میں کسی قسم کی نرمی اور انس نہ تھا، اس کا دل عجیب سے انداز میں ڈوبا۔

''سنو دارین! ایک عورت ہو کر اتنی بے قراری؟ عورت تو اپنے وقار اور حد میں ہی اچھی لگتی ہے، جذبات سے اس قدر مغلوب ہو کر خود پر قابو نہیں رکھ سکتی؟'' ان کا سرد لہجہ اور آگ کے شعلوں کی مانند جلتے وہ الفاظ دھڑ

دھڑ دارین کو جلا گئے۔

اتنی توہین؟ اس قدر ذلت؟ کاش وہ اس شخص کو دوبارہ کبھی اپنی صورت نہ دکھا پائے، اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے اس نے انتہائی دل سے دعا کی تھی۔

''اپنی سطح سے اس قدر گرنا، کیا کہوں تمہیں، تربیت کی کمی یا نفس کی کمزوری؟'' انہوں نے بے رحمی سے بات تربیت پہ ختم کر دی تھی۔

دارین کی ٹانگیں لرزنے لگیں، بہت سی بے اختیار سسکیاں اسکے لبوں سے آزاد ہوئیں تھیں جب انہوں نے ہاتھ اس کے کندھے سے ہٹا لیا، بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر وہ پھر سے سگریٹ سلگا رہے تھے جب وہ بمشکل وہاں سے اٹھی اور اندھوں کی مانند دیوار سے ٹکراتی ہوئی ملحق کمرے کی طرف بھاگ گئی، کانپتی انگلیوں کے ساتھ اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا تھا اور پھر جیسے ضبط کا دہانہ کھل گیا۔

وہ زور زور سے رونے لگی، مگر پھر اس خوف سے کہ کہیں آواز باہر نہ چلی جائے اس نے سختی سے اپنے ہونٹوں پہ اپنے دونوں ہاتھ جما لیے۔

وہ اسے کیا سمجھتے تھے؟ اسے احساس ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک مستقل پچھتاوا اس کے اندر گھر کر گیا، وہ اسے اتنا ہلکا، اتنا بے وقعت اور حقیر سمجھتے تھے، اسے لگا وہ کبھی ان سے آنکھ نہ ملا سکے گی۔

☆.....☆.....☆

شہزادی کو اجنبی دیسوں کی سیر کا از حد شوق تھا اور جب شہزادہ اسے اپنے ہمراہ پروں والے سفید خوبصورت گھوڑے پر سوار کر کے بادلوں میں اونچا سے اونچا لیتا گیا تو اس اجنبی مگر دلکش اور حیران کن دنیا نے اپنی خوبصورتی سے اس کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا، اسے اسپر کر لیا تھا، وہ ہنس رہی تھی، کھلکھلا رہی تھی، وہ خوش تھی، بہت خوش، مگر پھر.....رات ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

''تم نے دیکھا دارا؟ میرے ساتھ کیا ہوا؟'' آنکھوں میں آنسو لیے اس نے بھائی کو دیکھا، جو اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر پریشان ہی نہیں مضطرب بھی ہو گیا تھا۔

''تم رومت، بس تم چپ کرو نا۔'' وہ اپنے نرم ہاتھوں سے اس کا چہرہ صاف کرنے لگا۔

''تم اس سے کبھی بات مت کرنا بس اور اس اگر وہ بلائے بھی تو اس کے پاس مت جانا۔'' وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

''مگر.....!'' وہ کچھ کہنے لگی جب دارا نے اسے ٹوکا۔

''وہ گندا ہے، وہ مجھے پسند نہیں ہے، وہ تمہیں مارتا ہے۔'' دارا نے انتہائی دکھی انداز میں اس کا ہاتھ لاشعوری طور پر مضبوطی سے تھاما جیسے اسے کہیں نہ جانے دینا چاہتا ہو۔

اسی اثناء میں باہر سے آواز آنے لگی، اس کا ہاتھ دارا کے ہاتھ میں کسمسایا تھا۔

''مجھے جانا ہے، دارا مجھے جانے دو۔'' وہ زرد رنگ کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے دروازے کو بھی دیکھ رہی تھی جہاں سے ہر لمحہ کسی کے آجانے کا خطرہ تھا۔

''نہیں میں نہیں جانے دوں گا۔'' وہ ضدی انداز میں بولا تھا، گرفت اس کے ہاتھ پہ کچھ مزید مضبوط کی تھی۔

آواز پھر سے آئی تھی، اس نے یکدم سے ہاتھ کی گرفت سے آزاد کروایا اور باہر بھاگ گئی۔

☆.....☆.....☆

عجب ہے رنگ چمن جا بجا اداسی ہے
مہک اداسی ہے باد صبا اداسی ہے
نہیں نہیں یہ کس نے کہہ دیا تم سے
میں ٹھیک ٹھاک ہوں ہاں بس ذرا اداسی ہے
تمہیں ملیں جو خزانے تمہیں مبارک ہوں
میری کمائی تو یہ بے بہا اداسی ہے

اس نے ہر طریقے سے انہیں منانے کی کوشش کی تھی، ایک سرخ رنگ کے کاغذ پر بہت خوبصورت پھولوں کا اسکیچ بنا کر معافی کی درخواست لکھ کر رات ان کے آگے رکھ دیا تھا، جسے انہوں نے دیکھے بغیر ایک طرف کر دیا، وہ شخص خاموشی کی مار مارنے میں کس قدر طاق تھا، اس نے ان سے بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ یوں ہو گئے کہ جیسے بہرے ہوں اور تسلی سے سگریٹ پیتے ہوئے اپنے موبائل فون پر مصروف رہے اور ان کی خاموشی نے

دارین کو از حد خوفزدہ کر دیا تھا۔

''کیا وہ اب کبھی اس سے بات نہ کریں گے؟'' اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کوئی دسویں دفعہ اپنی بہتی ہوئی آنکھوں پر چھینٹے ڈالتے ہوئے خود سے سوال کیا تھا اور پھر ہراسان ہو کر رو دی، اس کے اعصاب ٹوٹ رہے تھے۔

کس قدر گناہ گار اور بری تھی وہ جانے کیوں اسے گھن آئی تھی اور کپڑے بدلنے کے بعد وہ کمرے میں جانے کی بجائے وہیں زمین پہ بیٹھ گئی اور جب اسے اپنی ماں کی باتیں یاد آئیں تو اسے رونا آیا تھا، وہ تو پہلی بار میں ہی ماں کی تربیت پہ انگلی اٹھوا بیٹھی تھی، اسے بے تحاشا رونا آ رہا تھا، اب کیا ہوگا؟ کی گھنٹی مستقل اس کے اعصاب پر برس رہی تھی۔

مگر حیرت انگیز بات، رات سوتے وقت ایک ہی بستر پر وہ پھر اس کے ساتھ کل جیسے تھے، وہ حیرانی سے گنگ سی ہو گئی، جب انہوں نے اس کو پیار سے سینے سے لگا کر اس کے گال چومے اور جب اس کے بالوں کو بستر پر دور تک پھیلا دیا اور جب اس کو ہنسنے کا کہا تو وہ بھی سب بھول کر کھلکھلا دی۔

پگلی! یہ نہیں جانتی تھی کہ مرد کی صبح اس کی رات سے کتنی مختلف ہوتی ہے۔

اگلی صبح وہ چلے گئے، اسی طرح اجنبی اور سرد مہر سے اور ان کے جانے کے بعد اگلی رات وہ ان کی سفید شرٹ کو سینے سے لگائے بھینچی بھینچی سسکیوں سے روتی رہی تھی، وہی سفید شرٹ جو اس نے چھپالی تھی اور جس سے ان کی خوشبو آتی تھی، بڑی سحر انگیز اور بارعب مہک جو اسے دیوانہ کر دیا کرتی تھیں۔

☆.....☆.....☆

''شہزادی نے اندھیرے سے گھبرا کر شہزادے کو دیکھا تو حیرت و خوف سے منجمد سی ہو گئی۔''

وہاں تو کوئی اور ہی تھا، شہزادے کی جگہ اب ایک بدصورت اور خوفناک دیوزاد کھڑا تھا جس کے خونی پنجے، لمبے دانت اور لہو رنگ آنکھیں شہزادی کا ننھا سا دل سہا گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

آٹھ سالہ وہ ننھی لڑکی مسلسل گھاس پر بھاگ رہی تھی، بہت تیز بھاگتے بھاگتے اس نے پھولے ہوئے

سانسوں کے ساتھ یکدم رُکتے ہوئے ایک درخت کے تنے پر ہاتھ رکھ کر سانس بحال کرنے کی کوشش کی تھی جب پیچھے سے یکدم دارا نے اسے دبوچ لیا، وہ پکڑی جا چکی تھی، دارا زور زور سے جوش میں آ کر چلا رہا تھا، وہ شکست خوردہ اسے انداز میں یکدم ہنستی چلی گئی، دارا بھی ہنس رہا تھا، وہ ایک بار پھر اسے ہرانے میں کامیاب ہو گیا تھا، وہ ہمیشہ جیت جاتا تھا۔

سب ٹھیک نہیں تھا، سب ٹھیک ہو ہی نہیں سکتا تھا، وہ جیسے خود سے جنگ لڑتی نڈھال ہو رہی تھی ''شیش محل'' اسے راس نہیں تھا، وہ ہنس نہیں سکتی تھی، وہ کھلکھلا نہیں سکتی تھی، ہاں وہ بس رو سکتی تھی جو کہ وہ روتی تھی بہت زیادہ روتی تھی، راتیں گزرتی نہ تھیں راتیں عذاب تھیں اور دن برزخ جیسے!!!

مگر ''شیش محل'' میں تو سب ٹھیک تھا، سب بہت اچھے تھے، پھر غلطی کہاں تھی؟ اسے جیسے سمجھ نہیں آئی تھی۔

پہلی غلطی اس کے ہاتھوں تب ہوئی جب ولیمے کے بعد پہلا باقاعدہ کھانا کھاتے وقت اس نے اپنی پسند کا اچار گوشت دیکھ کر بہت خوش ہو کر اپنی پلیٹ میں ڈالنے کے لیے چمچ اٹھایا تھا جب اس نے اپنی ساس کو دیکھا جو بڑی رعونیت سے اپنی بہن فردوس خانم سے مخاطب تھی کہ جو لوگ خاندانی ہوں اور جن کی تربیت اچھے ہاتھوں میں ہوئی ہو ان کا پتہ کھانے کی میز پر چلتا ہے، جب وہ پلیٹ بھر کر گوشت ڈالتے ہیں، الفاظ تھے یا زہر میں بجھی سوئیاں، اس کے پیر لرز اٹھے، اسے لگا یہ بات صاف اسے سنائی جا رہی تھی، حالانکہ ایسا نہیں تھا، اس نے چمچ وہیں رکھ دیا۔

اور اس دن کے بعد اس نے مرغن کھانوں اور گوشت کے مختلف اقسام کے کھانوں کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا کیونکہ آخر سوال تربیت کا تھا، وہ کس طرح اپنی ماں کو قصوروار ٹھہرا سکتی تھی۔

اس دن کے بعد وہ بھی ماں کے لیے بنائی جانے والی ابلی سبزیاں، دالیں اور پرہیزی کھانا کھانے لگی، جب انہوں نے اسے ٹوکا تو اس نے بڑی خوبصورت سے انہیں ٹال دیا، انہوں نے نئی نویلی دلہن سمجھ کر زیادہ زور نہ دیا کہ کہیں برا ہی نہ مان جائے اور یہ کیسا عجیب اور ذلت آمیز تزکیہ نفس تھا جسے کرتے وہ نڈھال ہوتی جاتی تھی۔

بہت دفعہ یوں ہوتا کہ ماں کی ٹانگیں دباتے اور ان کے سونے سے پہلے والے معمولات نمٹاتے نمٹاتے اپنا رات کا کھانا بھول جاتی اور گئی رات اپنے کمرے میں بھوک سے بلکتے ہوئے اسے بے تحاشا رونا آتا، کئی مرتبہ وہ

سوچتی کہ جا کر کچن سے کھانا نکال لائے مگر پھر وہ خوف اس کے ذہن مین پنجے گاڑھ لیتا کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو وہ کیا سمجھیں گے کہ وہ اس قدر بھوکی تھی کہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر کھانا کھاتی تھی۔

پھر بہت بار ایسا ہوا کہ اس نے سوچا کہ کیوں نہ وہ پہلے سے اپنے کمرے مین کچھ رکھ لے، کوئی خشک کھانے والی چیز، کوئی پھل وغیرہ مگر یہ سوچ بھی عمل سے محروم رہی کیونکہ اسے ڈر تھا کہ اگر کسی کو پتہ چل گیا تو؟ اور یہ کس قدر عجیب بات تھی کہ وہ ''شیش محل'' کے اکلوتے وارث کی بیوی تھی اور اس کے پاس خرچ کے نام پر ایک روپیہ تک نہ تھا، شادی میں جو سلامیاں اسے جمع ہوئیں وہ اس نے جوں کی توں اپنی ساس کے آگے رکھ دیں اور اس کے بعد کسی بات کا اتا پتہ نہ تھا، حیدر شادی کے بعد دو دن کے لیے گھر آئے تھے اور انہوں نے بھی اس متعلق اس سے کوئی بات نہ کی اور نہ ہی کوئی نوٹس لیا تھا، ان کے پاس اپنے ہی بکھیڑے کم نہ تھے۔

☆.....☆.....☆

اس نے سوچا تھا اب کی بار وہ آئیں گے تو وہ قطعاً ان سے بات نہیں کرے گی، لیکن پھر وہ خود ہی اپنی سوچی ہوئی بات پر ہنس پڑی، وہ بھلا اس سے کب کوئی بات کرتے تھے؟ دارین کو یاد نہیں آیا کہ ان دونوں میں انہوں نے ایک دفعہ بھی اس کا حال پوچھا ہو؟

اسے یاد آیا وہ تو اس سے بات ہی نہ کرتے تھے، رات کو جب کمرے میں ہوتے تو سونے سے پہلے کا سارا وقت سگریٹوں اور موبائل کی نظر ہو جاتا، اسے بہت عجیب لگتا، سگریٹ کے دھوئیں سے اس کا دم گھٹتا تھا مگر وہ احتجاج کا ایک لفظ بھی بولنے کی مجاز نہ تھی، وہ جیسے اس کے وجود سے قطعاً بے خبر ہوتے تھے اور وہ کروٹوں پہ کروٹیں بدلتی نڈھال سی ہو جاتی سارے دن کی تھکن کے بعد نیند سے بند ہوتی آنکھیں لیے وہ کبھی کسی چیز پر نظریں جما کر سوچتی کہ آخر ان کی نظر کرم کب ہوگی اس پر اور اکثر یوں ہوتا کہ جب وہ نیم غنودگی میں چلی جاتی تو یکدم سے ان کا فون بجنے لگتا اور وہ بڑے انہماک سے فون اٹھا کر انگلش میں بات کرنے لگتے، نپا تلا، شستہ اور خوبصورت لہجہ۔

وہ حیرانی سے سنتی رہتی خواہ اسے سمجھ نہ آتی تھی مگر پھر بھی وہ انہیں سنتی رہتی اور ہر بات اپنی یاداشت میں محفوظ کرتی جاتی تھی، اسے ان کی آواز بہت اچھی لگتی تھی، خواہ وہ کسی اور سے ہی کیوں نہ محو گفتگو ہوتے اور جب وہ

موبائل ایک طرف رکھ کر کمرے کی روشنی بند کر کے اس کے قریب آتے تو اندھیرے میں اس کا دل ڈوبنے لگتا، اسے اندھیروں سے وحشت ہوتی تھی مگر یہاں بات خواہش اور ضرورت یا احساس کی کب تھی یہاں صرف ان کی مرضی چلتی تھی، وہ صرف ایک بے جان پتلی تھی۔

دونوں میں بے پناہ فرق تھا، وہ صرف ان سے عمر کے لحاظ سے ہی چھوٹی نہیں تھی بلکہ وہ قد و قامت کے لحاظ سے بھی ان کے آگے ننھی گڑیا سی تھی، بمشکل ان کی کہنیوں سے کچھ اوپر تک آتی تھی دبلی پتلی سی اور چہرے پہ بے انتہا معصومیت لیے وہ ان کے پہلو میں کھڑی ہوتی تو کیا قیامت ڈھاتی۔

اور یہ کتنی عجیب بات تھی کہ اتنی کم عمری و معصومیت لیے جب وہ ان کے بازوؤں میں ہوتی تو ان کے انداز میں کوئی نرمی یا احتیاط نہ ہوتی تھی، وہ مزاجاً کرخت اور سرد مہر تھے، یا شاید صرف اسی کے لیے تھے، اسے کچھ پتہ نہ تھا، وہ اتنے انجان اور اجنبی تھے کہ بہت دفعہ وہ سوچتی اگر وہ مر جائے تو شاید تب بھی وہ اس اجنبیت سے ماں سے کہیں گے۔

''کوئی بات نہیں ماں، اس طرح کے چھوٹے موٹے حادثے زندگی میں ہوتے رہتے ہیں۔''

اور یہ سوچ اسے لرزا دیتی اور پھر سوچتی اسکی شادی حیدر چوہدری سے کب ہوئی تھی اس کی شادی تو اس گھر سے ہوئی تھی اور وہ بخوبی اس گھر سے اپنا رشتہ نبھا رہی تھی، ہاں واقعی اسے بس شیش محل سے بیاہا گیا تھا۔

وہ اتنی بے خبر تھی کہ نہیں جانتی تھی کہ انہیں کیا پسند تھا اور کیا ناپسند؟ وہ کون سا رنگ پہننا پسند کرتے تھے کیا کھانا پسند کرتے تھے اور کیا سوچتے تھے؟ وہ اسے کیسا دیکھنا چاہتے تھے؟ اسے بس اتنا پتہ تھا کہ انہیں اس کا بننا سنورنا پسند نہیں تھا اور بس اس سے زیادہ وہ کچھ نہ جانتی تھی۔

اس نے نم آنکھوں سے ڈائری بند کر دی اور پھر بے جان ہاتھوں سے ایک تصویر اٹھالی، اس میں اسلام آباد کے پہاڑی علاقے کا خوبصورت منظر تھا، اس تصویر کے پیچھے بھی ایک مکمل کہانی تھی، اسے یاد آیا جب بڑے ماموں کے بڑے بیٹے یعنی سجاول بھائی کی شادی ہوئی تھی تو وہ نگینہ بھابھی کو گھمانے کے لیے اسلام آباد اور مری لے کر گئے تھے، یہ اسی جگہ کی تصویریں تھیں اور جب اسے پتہ چلا تھا کہ اس کے ہونے والے شوہر بھی اسلام آباد میں تعینات تھے تو اس نے چپکے سے ان کی تصاویر میں سے ایک تصویر نکال لی تھی، اس تصویر میں صرف اس

پہاڑی علاقے کا منظر تھا اور پس منظر میں ڈھیر ساری عمارات تھیں، وہ شادی سے پہلے اکثر اس تصویر کو دیکھ کر سوچا کرتی تھی کہ وہ بھی انہی عمارتوں میں کہیں رہتے ہوں گے اور یہ سوچ کر اس کے اندر ایک عجیب سی خوشی بھر جایا کرتی تھی۔

اس نے سوچا تھا کہ وہ ان سے ضرور فرمائش کرے گی کہ وہ اسے بھی اسلام آباد لے کر جائیں، وہ بھی چاہتی تھی کہ وہ ایک حویلی سے نکل کر ساری دنیا نہ سہی اس کی ایک جھلک تو دیکھے مگر۔

ہم نے چاہا تھا کہ تقدیر یگوں ہو جائے کے مصداق فرق پتہ نہیں کہاں تھا کہ یہ ممکن نہ ہو سکا تھا۔

کہیں باہر لے کر جانا تو دور کی بات تھی وہ تو اسے اپنے گاؤں تک میں نہ لے کر گئے تھے وہ صرف شیش محل میں آئی تھی اور اس کے باہر کی دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا اس کی قسمت میں صرف شیش محل کے اندھیرے آئے تھے اور یہ کتنی عجیب بات تھی کہ جب بھی اس کی اپنی ماں سے بات ہوتی وہ بہت یقین سے مسکرا کر انہیں اپنے خوش ہونے کا ثبوت دیتی تھی اور فون بند کرنے سے پہلے ہمیشہ "سب ٹھیک ہے" کا کلیرنس سرٹیفکیٹ ان کے ہاتھ میں تھمانا نہ بھولتی تھی، اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔

اب جو ہوا تھا وہ اس پر جتنا بھی روتی، ماتم کرتی کم تھا اب کی بار اس نے اپنا مان اپنی تکریم اور عزت نفس کھو دی تھی، بس اتنا ہی تو کہا تھا ان سے کہ ابھی مت جائیں اور وہ قصوروار ٹھہرا دی گئی تھی، وہ تو جیتے جی مر گئی تھی، بھلا اس سے بڑھ کر ذلت کیا کم تھی کہ انہوں نے وقار سے گر جانے کا طعنہ دے دیا تھا، وہ بار بار ان کے الفاظ یاد کرتی اور نئے سرے سے رونے لگتی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی ڈائری کے صفحات بھرتے چلے جاتے۔

☆.....☆.....☆

کیا تم نے دیکھا ہے۔
کبھی کوئی ایسا بچہ؟؟؟
جسے اس کے ماں باپ
روتا چھوڑ کر چلے گئے ہوں!!!

دارا اور وہ تب سے بیٹھے رو رہے تھے، ماں نے اسے مارا تھا کیونکہ وہ بار بار اپنے بابا کا پوچھتی تھی جو کہ انہیں

چھوڑ کر کہیں چلے گئے تھے، اب وہ ساری بات دارا کو بتا کر اس کی ہمدردی سمیٹ رہی تھی، جو کہ اسے چپ کرواتے ہوئے خود رو پڑا تھا۔

شہزادی کو قید کر دیا گیا، اس کا جرم بہت بڑا تھا، اس نے دیوزاد کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

حکم کیا تھا؟

وہ اسے ہنستا دیکھنا چاہتا تھا، ہر وقت ہر صورت اور وہ معصوم شہزادی کیسے ہنستی؟ اسے تو جدائی رلاتی تھی اپنے ماں باپ سے دوری کی جدائی۔

☆.....☆.....☆

سردی کی خون سرد کو دینے والی سردی اور دھند بھرے دنوں کے باعث ہونے والی چھٹیوں میں وہ بنا اطلاع کے اچانک چلے آئے۔

یہ مغرب کا وقت تھا جب کہ وہ معمول کے مطابق ماں کے پیروں اور ٹانگوں پر مالش کر رہی تھی جب دروازے پہ ان کے سلام کی آواز نے انہیں چونکا دیا، ماں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔

وہ ان کے پاس آ کر ذرا سا جھک گئے، ماں نے دونوں بازو پھیلا کر انہیں سینے سے لگا کر ان کا ماتھا چوما تھا، دارین نے مدہم سا سلام کیا، وہ جواب دیتے ہوئے ماں کے ساتھ بیٹھ گئے، دارین کے ہاتھ ذرا سے کانپے مگر وہ وہاں سے اٹھی نہیں، اس نے اسی طرح اپنا کام جاری رکھا، اب وہ ماں سے محو گفتگو تھے، بڑے مودب و نرم لہجے میں محبت سے بھرپور انداز میں ان کو ان کے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے وہ کتنے مختلف لگ رہے تھے، دارین کی نظر بار بار ان پر اٹھ رہی تھی، تبھی ماں نے اسے یہ کہہ کر ٹوکا تھا کہ وہ حیدر کے لیے کچھ لے کر آئے، مگر وہ کپڑے بدلنے کا کہہ کر خود بھی اٹھ گئے، ماں نے اسے بھی فوراً پیچھے جانے کا اشارہ کیا تھا، وہ خاموشی سے ان کی بات مان کر اٹھ گئی، کمرے میں آ کر انہوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی تھی، اس نے انہیں شلوار کرتا نکال کر دے دیا اور وہ نہانے چلے گئے، جب وہ نہا کر لوٹے تو ان کا موبائل بج رہا تھا، وہ بال بنانے میں مصروف تھے جبھی انہوں نے دارین کو موبائل پکڑانے کا اشارہ کیا تھا، دارین نے بہت ڈرتے ڈرتے ان کا خوب بڑا سا سیاہ رنگ کا موبائل دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور ان کی طرف بڑھا دیا۔

وہ موبائل کان کے ساتھ لگا کر بات کرنے لگے اور دارین ان کا سامان سیٹ کرنے لگی، جتنی دیر وہ بات کرتے رہے وہ بھی مصروف رہی جیسے ہی انہوں نے فون کان سے ہٹایا وہ پھر سے ان کے نزدیک آ گئی۔

''کھانا نہیں کھاؤں گا میں، بس چائے لے آؤ۔'' انہوں نے کہتے ہوئے عادتاً سگریٹ نکال کر سلگایا اور بیڈ پر نیم دراز ہو گئے، وہ سر ہلاتے ہوئے باہر نکل گئی، اس کا مطلب یہ تھا کہ آج کا کھانا پھر گیا۔

جب وہ چائے لے کر آئی تو پھر سے فون پر مصروف تھے، وہ ان کے قریب چائے رکھ کر پھر سے باہر نکل گئی، کچھ دیر بعد واپس آئی تو ایک بدلے ہوئے لباس اور دھلے ہوئے چہرے کے ساتھ تھی، کمرے میں ایک بار پھر سگریٹ کا دھواں، ان کی انگلش اور مدھم روشنی تھی، وہ آہستہ سے بیڈ پر بیٹھ گئی، دونوں ہاتھ سر پر لے جاتے ہوئے اس نے انہیں دیکھا جو کہ فون بند کر کے اب مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ ہو چکے تھے، پھر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے پاس بلا لیا، وہ اٹھ کر ان کے پاس چلی آئی، انہوں نے ایک ہاتھ سے سگریٹ بجھاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اسے قریب کر لیا اور روشنی مدھم کر دی، دارین نے اس نیم تاریکی میں بہت غور سے ان چہرے کو دیکھا، نجانے کیوں اسے لگا ان کی آنکھوں میں سرخی اتری ہوئی تھی اور پھر سارے کمرے میں یہ سرخی پھیل گئی تھی۔

اگلی صبح وہ جاگ ہی نہ سکی، ماں کی نماز قضا ہو گئی، حیدر کا موڈ سخت برہم تھا، انہوں نے دارین کو ماں کے سامنے اتنا سخت ڈانٹا تھا کہ وہ لرزتی ٹانگوں کے ساتھ روتی جا رہی تھی مگر وہاں اس کی وضاحت سننے والا کوئی نہ تھا، ماں نے بھی درمیان میں بولنے کی کوشش نہ کی تھی، شاید حیدر کے غصے کی وجہ سے وہ بھی خائف تھیں۔

جب انہوں نے اسی غصے سے اسے وہاں سے جانے کا کہا تو وہ بھاگنے کے سے انداز میں وہاں سے نکل گئی، اپنے کمرے میں آ کر اس نے بمشکل اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے اپنا حلیہ ٹھیک کیا تھا، یہ ناشتے کا وقت تھا اور اگر ناشتے میں تاخیر ہو جاتی تو شاید ناقابل معافی ہوتی۔ جبھی وہ خود پر قابو پا کر ناشتے کی تیاری میں لگ گئی، ناشتے کی ٹرے اٹھا کر جب وہ ماں کے کمرے کی طرف گئی تو اندر سے اٹھنے والی بلند آوازوں کے باعث اسے رک جانا پڑا۔

''دارین ایک لاپرواہ اور غیر ذمہ دار لڑکی ہے ماں، آپ ابھی کا واقعہ دیکھ لیں، میں نہیں سمجھتا کہ وہ اس قابل

ہے کہ ایک بچے کی دیکھ بھال کر سکے، اس لیے آپ ابھی اس موضوع کو بند رہنے دیں اور پوتے کو فی الحال بھول جائیں۔'' ان کا لہجہ تلخ سرد اور دوٹوک تھا، اسے لگا چاروں طرف سے اس پر تیروں کی بوچھاڑ کر دی گئی تھی، یوں جیسے اس کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا، یہ کیا کہہ رہے تھے وہ؟ وہ یعنی دارین چوہدری ان کی شرعی بیوی اس قابل نہ تھی کہ ان کی اولاد پیدا کر سکتی؟ سارا دن اس کا دماغ جیسے کسی خلا میں معلق رہا، وہ بھاگ بھاگ کر سارے کام کرتی رہی، کبھی ماں کو وضو کروانا، کبھی سر میں مالش کرنا کبھی ان کے لیے یخنی بنانا دوسری طرف حیدر کے کام بھی ایسے ہی کرتی رہی، پتا نہیں کیوں وہ خود کو ذمہ دار ثابت کرنا چاہتی تھی، دسمبر کی سرد رات میں ایک بارش اس کے اندر اتر آئی تھی۔

وہ حیدر چوہدری کے نزدیک اس قابل تھی کہ اس کے ساتھ چند پل تو گزارہ کیا جاتا مگر اس قابل نہیں تھی کہ ان کا وارث پیدا کر سکتی۔

''اتنا تضاد؟ ایسی منافقت؟'' اس کا دل چیخ چیخ کر رونے کا چاہا مگر ہمیشہ کی طرح اس نے ہونٹ بھینچ کر ضبط کے بند باندھ لیے۔

ضبطِ غم آسان نہیں عالی
آگ ہوتے ہیں وہ آنسو جو پیے جاتے ہیں

یہ آگ بھی اس کے اندر اتر گئی، اس کو اپنے سرخ شعلوں سے جھلسا کر اس کا کلیجہ جھلسا گئی۔

حیدر کے سونے کے بعد بھی وہ جاگتی رہی، یہ خوف بہت بھاری تھا کہ اگر آج بھی وہ نہ جاگ سکی تو؟ اس خوف نے اس کی نیندیں اڑا دیں اور تہجد کی اذان ہوتے ہی اس نے بستر چھوڑ دیا۔

☆.....☆.....☆

دارا نے اس کا ہاتھ پکڑا سے واپس بٹھا دیا، وہ بہت ناراض تھی، سب سے ناراض اور خفا۔

''پتا ہے دارا، میرا دل کیا چاہتا ہے؟''

''کیا؟''

''میرا دل چاہتا مجھے اچانک سے کوئی بہت بڑی بیماری لگ جائے اور پھر سب میرے پاس آجائیں، میری

بات سنیں، میری فرمائشیں پوری کریں، مجھے پیار کریں اور پھر..... میں مرجاؤں لیکن کم از کم کچھ روز کے لیے ہی سہی سب کا پیار اور توجہ تو حاصل کر سکوں۔'' وہ حسرت سے کہہ رہی تھی، دارا سفید چہرہ لیے اسے دیکھ رہا تھا۔

''ایسا کیوں کہہ رہی ہو، سب پیار کرتے ہیں تم سے؟'' وہ افسردگی سے کہہ رہا تھا، انداز کسی قدر کم زور مگر یقین ڈالنے والا تھا۔

''جھوٹ ایک دم جھوٹ کوئی پیار نہیں کرتا مجھ سے۔'' وہ چلا کر کہتی رونے لگی۔

''میں تو پیار کرتا ہوں نا تم سے۔''

''مگر تم تو بھائی ہو میرے، تم تو کرتے ہو مجھے پتا ہے، مجھے سب کا پیار چاہیے۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور یہاں آ کر دارا بے بس تھا۔

☆.....☆.....☆

دسمبر کی سردی بہت سخت تھی اور کھلے علاقے کی وجہ سے دھند بھی خوب چھائی ہوئی تھی، مگر اس کے باوجود وہ پچھلے صحن میں گرم چادر لپٹے ماں کے زیر استعمال جائے نمازیں دھو رہی تھی اور پاس کھڑے عیشاں صرف اس کا منہ دیکھ رہی تھی، وہ اسے کچھ کرنے ہی نہ دیتی تھی، اس کے بعد اس نے برآمدے میں خشک ہونے کے لیے ڈلوائے اور پھر کچن کی طرف بڑھ گئی، ملازماؤں کو ضروری ہدایات دینے کے بعد اس نے کھانا لگوانا شروع کر دیا، ماں اور حیدر اور بابا کو کھانے کا کہہ کر وہ لباس تبدیل کرنے کمرے میں آئی تھی، اس کی آستین گیلی تھیں اور اس لباس میں وہ قطعاً میز پر نہیں جا سکتی تھی۔

مگر سامنے حیدر کو دیکھ کر ٹھٹک گئی، پتہ نہیں وہ کمرے میں کب آئے، وہ تھوڑا سا آگے بڑھی تھی جب ان کی آواز پر رک گئی۔

''ادھر آؤ دارین۔'' انہوں نے کہا تو وہ ان کے قریب آ گئی۔

''یہاں بیٹھو۔'' انہوں نے اس کا بازو پکڑ کر اسے بیڈ پر بٹھا دیا، جبکہ خود وہ موبائل پکڑ کر اسے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

''اب ادھر دیکھو۔'' انہوں نے اپنی طرف اشارہ کیا، اس نے الجھی ہوئی نظروں سے دیکھا جب انہوں نے

بٹن دبایا، کیمرے کا فلش چمکا اور تصویر موبائل میں قید ہوگئی، انہوں نے رک کر ایک لمحہ تصویر کا جائزہ لیا اور پھر سر ہلاتے ہوئے اسے جانے کا اشارہ کر دیا، وہ اسی الجھن کا شکار اٹھ کر اندر کی طرف بڑھ گئی، پتا نہیں انہوں نے کیا کیا تھا؟ وہ تو اسی بات پر شکر منا رہی تھی کہ انہوں نے گیلی آستین نہیں دیکھی تھیں ورنہ اسے یقیناً بہت سخت ڈانٹ پڑتی۔

کھانے کی میز پر وہ پھر سے ابلی سبزیاں سیاہ مرچ میں پکی ہوئی چپاتی کے ساتھ کھا رہی تھی جب ماں نے اسے ٹوکا۔

''بہو خانم! ٹھیک سے کھانا کھایا کرو، یہ کیا تم میری طرح بیماروں والا کھانا کھاتی ہو۔'' ان کی نظریں اس کی پلیٹ پر تھیں، سب کے سامنے اسطرح ٹوکے جانے پر وہ بری طرح شرمندہ ہوئی تھی اور اس سے زیادہ گھبرا گئی تھی۔ حیدر کی کڑی نظروں کا گھیرا خود کے گرد دیکھ کر اس کی آواز بھی حلق میں گھٹ گئی تھی، ورنہ شاید وہ کوئی وضاحت دے دیتی۔

اور اس رات وہ بہت دیر تک لباس تبدیل کرنے کے بہانے چھپ کر روتی رہی پتہ نہیں کیوں آج دل چاہ رہا تھا وہ حیدر کے پاس نہ جائے اور جب وہ کمرے میں آئی تو وہ حسب معمول موبائل پر مصروف تھے۔

وہ سست روی سے بیڈ کے ایک سرے پہ ٹک گئی، اسے اس بات کا اندازہ تھا کہ اپنے کاموں سے فارغ ہو کر جب وہ اس کی طرف متوجہ ہوں گے تو روشنی گل ہو جائے گی اور یہ ایک لحاظ سے اس کے لیے بہتر ہی تھا، شاید وہ اس کی سوجی آنکھیں دیکھ کر مزید برہم ہوتے اور سوالات کرتے اور جن کے جوابات یقیناً اس کے پاس نہ ہوتے، ویسے بھی اب وہ اسے مسکرانے کو نہیں کہتے تھے، یہ بھی ایک طرح کی آزادی ہی تھی ورنہ اگر مسکرانے کی کوشش میں اس کی آنکھیں چھلک پڑتیں تو کتنا برا ہوتا، اسے کتنا دکھ ہوتا اگر وہ اسے پھر سے جھڑک دیتے اور ان کی آنکھوں میں سرخی اتر آتی جس سے اسے انتہائی ڈر لگتا تھا۔

اسکے ہاتھ انتہائی ٹھنڈے تھے اس نے کمبل کھول کر پھیلا دیا پھر دونوں ہاتھ کمبل میں چھپا لیے، ساتھ ہی دزدیدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا جن کو سردی کا کوئی اثر ہی نہ تھا، پھر اس نے آگے بڑھ کر کمبل ان کے اوپر بھی ڈال دیا، سبز شال اوڑھے ہوئے سرد ہاتھوں سے جب وہ ان پر کمبل درست کر رہی تھی تو انہوں نے ہاتھ

پکڑ کر وہیں روک لیا تھا، اس نے یکدم نظریں اٹھا کر دیکھا تو دونوں کی نظریں ملی تھیں اور حیدر کے تاثرات یکدم بدل گئے، ان کے چہرے پر الجھن اور آنکھوں میں حیرانی تھی، انہوں نے الوداعی کلمات کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا، فون انتہائی عجلت میں بند کرنے کی وجہ نامعلوم کیا تھی اور دارین اندر سے انتہائی پریشان ہوگئی تھی، اسے احساس ہوگیا کہ وہ پکڑی جا چکی تھی۔

فون بند کر کے ایک طرف پھینکتے ہوئے ان کا انداز بہت جارحانہ تھا، ان کے بدلتے موڈ نے اس کی دھڑکنیں بدل دیا کرتے تھے۔

''کیا ہوا ہے؟'' اس کا ہاتھ چھوڑ کر انہوں نے اسے شانوں سے تھام لیا تھا، دارین کا رنگ بدل گیا۔

اسنے آہستہ سے نفی میں سر ہلا دیا، اس کے اس طرح سر ہلانے پہ حیدر کا رنگ بدل گیا تھا، انہیں اس کا سر ہلانا بے حد گراں گزرا تھا۔

''تم جانتی ہو تم کس سے بات کر رہی ہو؟''

انہوں نے طیش میں آئے بغیر سوال کیا تھا مگر لہجہ اتنا زہر خند تھا کہ دارین کا دل کہیں اندر ہی ڈوبا تھا اس کا سر کچھ مزید جھک گیا۔

''یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے؟ اخلاقیات کا پتہ نہیں ہے تمہیں؟'' اس بار انداز اور بھی سخت تھا اور یہ کہتے ہوئے یکلخت انہیں احساس ہوا کہ وہ لرز رہی تھی، انہوں نے اسکی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اسے اٹھایا تو اس کی آنکھیں بھری ہوئی جھیلیں بنی ہوئی تھیں جو کسی بھی لمحے چھلک پڑنے کو تیار تھیں، انہوں نے نرمی سے انگلی اس کی آنکھ پر پھیری تو وہ یکدم چھلک گئی اور ان کے ہاتھ کی پشت پر آنسوؤں کے قطرے ٹپک پڑے، وہ چند لمحے سے دیکھتے رہے، اس کی آنکھیں سوجی ہوئیں تھیں اور رونے کے سبب اس کی ناک سرخ ہو رہی تھی، مگر مجال تھی کہ اس کی کوئی سسکی اس کے لبوں کی قید سے آزاد ہو پاتی۔

''مجھے میری اماں یاد آ رہی ہیں۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں بمشکل کہا تھا، وہ اس کی بات پر ایک دم چونک گئے۔

''تو تم ان سے فون پر بات نہیں کرتی؟'' وہ حیرانی سے استفسار کر رہے تھے۔

''کرتی ہوں مگر میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔'' اس نے گڑگڑاتے ہوئے عرضی پیش کی تھی۔

''یہ ممکن نہیں دارین، تمہاری یہاں پر موجودگی از حد ضروری ہے، کیونکہ ماں کی ساری ذمہ داری تم پر ہے۔'' انہوں نے بہت ٹھنڈے لہجے میں انکار اس کے منہ پر مارا تھا۔

دارین کے دل پر ایک خنجر سا لگا تھا، اس ایک لحظے کو نظریں اٹھا کر ان کو دیکھا پھر سر جھکا دیا۔

''جی!'' وہ سر ہلا کے بولی تھی، حیدر کے چہرے پر عجیب سی چمک تھی۔

''جاؤ شاباش میرے لیے چائے بنا کر لاؤ۔'' وہ اس کا گال تھپک کر بولے تھے، وہ میکانکی انداز میں اٹھ گئی، کچن میں آ کر اس نے چائے بناتے ہوئے تل سے کوئی دس مرتبہ منہ دھویا تھا، مگر آنسو تھے کہ رکتے ہی نہیں تھے، چائے بنا کر مگ میں ڈالتے ہوئے اس نے آخری بار منہ دھویا اور ان کے کمرے کی طرف آ گئی۔

وہ بیڈ پر نیم دراز تھے، اس کے آہستگی سے دروازہ بند کرنے پر وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے، اس نے چائے ان کے پاس میز پر رکھ دی اور پھر خود دوسری طرف آ گئی، کمبل اوپر لیتے ہوئے اس نے انہیں دیکھا، وہ چائے کا کپ اٹھا رہے تھے۔

''آپ سے ایک بات پوچھ سکتی ہوں؟''

اس کی آواز میں واضح ہچکچاہٹ اور ڈر تھا۔

''ہاں بولو۔'' انہوں نے چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے اجازت دی تھی۔

''میں جاہل ہوں، بہت غیر ذمہ دار اور لاپرواہ ہوں، مجھے بولنے کی تمیز نہیں، مجھے کچھ نہیں آتا، مگر آپ مجھے بتائیں، مجھے سکھائیں، آپ مجھے کیسا دیکھنا چاہتے ہیں؟ میں ویسا بننے کی پوری پوری کوشش کروں گی۔'' وہ بہت اٹک اٹک کر بول رہی تھی، پورا پورا احساس کمتری میں ڈوبا لہجہ۔

''بہت بے وقوف ہو تم۔'' وہ ہنس پڑے۔

''میں تو مرد ہوں، میں تو ایسا ہی رہوں گا کبھی نہیں بدل سکتا، چاہوں بھی تو بھی نہیں بدل سکتا، میرے سامنے تم سونے کی بھی بن کے آ جاؤ گی میں تب بھی خامی ڈھونڈ لوں گا۔'' وہ مذاق اڑا رہے تھے، دارین کا دل کہیں اتھاہ گہرائی میں ڈوبتا جاتا تھا۔

''اس لیے کہتا ہوں میرے پیچھے مت بھاگو۔''

''اللہ سے دعا کیا کرو کہ تمہیں ایسا بنا دے کہ تم اسے پسند آجاؤ۔'' انہوں نے بہت خوبصورتی سے بات سمیٹ کر چائے کا مگ ایک طرف رکھا، روشنی گل کی اور اس کو نزدیک کر لیا، وہ بہت سرد ہو رہی تھی، حیدر نے کمبل اس کے اوپر کرتے ہوئے اس کو اپنے بازو پر لے لیا، پھر اس کی آنکھیں کو چومتے ہوئے اس کو سینے سے لگا لیا، پھر اس کو ایک گڑیا کی طرح بازوؤں میں لے کر اپنی مرضی سے توڑنے موڑنے لگے، مگر وہ کانچ کی گڑیا نہ تھی جو ذرا سی ٹھیس لگنے سے ٹوٹ جاتی وہ تو ربڑ کی گڑیا تھی، جتنا بھی توڑ لو، جتنا بھی استعمال کر لو، جتنی بھی اذیت دے لو واپسی اسی حالت میں آجاتی تھی۔

اور اگلی صبح بہت عجیب واقعہ ہوا، وہ نہا کر نکلی تو بہت دیر تک خود کو آئینے میں دیکھتی رہی، اس کی آنکھوں کے گرد گہرے حلقے نظر آرہے تھے، پھر سر جھٹک کر اپنے کمرے کی طرف آگئی، ابھی وہ بستر سے کچھ دور تھی جب یکدم ہی اس کا سر گھومنے لگا، اس نے سہارے کے لیے کسی چیز کو پکڑنے کی کوشش کی مگر بے سود، وہ پورے وزن کے ساتھ زمین پر گری تو حیدر کی آنکھ کھل گئی تھی۔

وہ ایک دم سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھے تھے، انہوں نے اسے گرے دیکھا تو ایک لمحہ کو ان کا رنگ بدلا تھا پھر انہوں نے خود کو سنبھالتے ہوئے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور بیڈ پہ لٹا کے اس پر کمبل درست کرتے ہوئے اس کی نبض دیکھی تھی اور پھر اس کے چہرے پہ پھیلے بال پیچھے کر دیئے، اس کے چمکیلے بال گیلے تھے، یقیناً وہ نہا کر نکلی تھی، انہوں نے اس کا تنفس دیکھا، اس کا سانس اٹک رہا تھا، ان کے چہرے پر تشویش لہرا گئی، اس کا ہوش میں آنا ضروری تھا، وہ اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگے اور کچھ دیر بعد اسے ہوش آگیا، اس کی مردہ نظر آتی آنکھیں کچھ دیر چھت پر جمی رہی تھیں پھر جیسے اسے ماحول کا ادراک ہوا اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا، اب اس کی نظریں جو حیدر پر پڑیں تو وہ قدر گھبرا گئی، اس نے بے ساختہ اٹھنے کی کوشش کی مگر وہ اس میں ناکام رہی، اس کی کہنی میں بری طرح درد ہو رہی تھی اور اٹھنے کی کوشش میں جب اس نے کہنی پر دباؤ ڈالا تو ایک کراہ کے ساتھ واپس لیٹ گئی، وہ آہستگی سے اس کے پاس آگئے، اس کا بازو پکڑ کر انہوں نے آستین اوپر کی تو کہنی پر نیل تھا، یقیناً اسے گرتے وقت یہی کہنی دباؤ میں آگئی تھی، وہ اٹھ کر مرہم نکال لائے اور مالش کرنے لگے، پھر اس کی

آستین برابر کر کے اس کے سامنے بیٹھ گئے۔

''اب ٹھیک ہو؟'' ان کا لہجہ نرم تھا۔

دارین نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا، اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔

''کیا ہوا تھا؟'' وہ پوچھ رہے تھے۔

''پتہ نہیں چلا، میں بس ادھر آ رہی تھی تو ایک دم سے آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا اور میں گر گئی،'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

ان کے چہرے پر تشویش کے رنگ تھے، اس کا یوں بے ہوش ہونا ٹھیک نہیں تھا، انہوں نے اس کا چہرہ دیکھا، اس کی آنکھوں کے گرد نیلے گہرے حلقے تھے اور وہ بہت کمزور لگ رہی تھی، انہوں نے نظر اس پر سے ہٹالی۔ اور دوپہر میں جب وہ ماں کے پاس بیٹھے تھے تو انہوں نے دبے دبے انداز میں ماں کو سب بتا دیا، وہ خاموشی سے ان کی بات سنتی رہیں پھر دھیرے دھیرے انہیں سمجھانے لگیں۔

''دارین اچھی لڑکی ہے حیدر، بے وقوف ہے مگر کام سنبھال لیا ہوا ہے اس نے یہاں کا، تھوڑی لاپرواہے اور اسی وجہ سے کھانے پر توجہ نہیں دے پاتی اور شاید اسے عادت ہی نہیں مرغن غذاؤں کی، جو بھی صورت حال ہے، میں کوشش کروں گی کہ اس کی خوراک کا خاص دھیان رکھوں اور تم بھی اسے تاکید کر دینا۔'' وہ سر ہلا کر اٹھ گئے، آج ان کا یہاں آخری دن تھا، کل وہ واپس جا رہے تھے، رات سونے سے پہلے عیشاں ان کے کمرے میں دو بڑے گلاس دودھ کے رکھ گئی، دارین نے حیرانی سے یہ منظر دیکھا اور جب حیدر نے اسے دودھ پینے کو کہا تو وہ حیرت سے تقریباً گر جانے والی ہو گئی تھی، ان کے بالکل سامنے بیٹھ کر اس نے گھونٹ گھونٹ دودھ پیا اور پھر گلاس رکھنے چلی گئی۔

واپس لوٹی تو وہی خاموشی اور تاریکی اور سگریٹ کا دھواں اس کا منتظر تھا اور اس نے دروازہ بند کیا اور ان کے برابر آ گئی، بے خیالی میں انہوں نے اسے ساتھ لگا لیا جب کہ سگریٹ ان کی انگلیوں میں سلگ رہا تھا اور وہ ان کے بازوؤں میں ایک ننھی لڑکی کی مانند سمٹی ہوئی تھی، کمرے کی فضا بوجھل اور غیر یقینی تھی، اس نے سر ان کے سینے پر رکھا ہوا تھا اور پتہ نہیں مگر اس کا دل چاہا تھا وہ آنکھیں بند کر کے سو جائے، وہ آہستہ آہستہ اس کے گال سہلا رہے

تھے، اسے پتہ تھا انہیں یہ کر کے پتہ نہیں کیا تسکین ملتی تھی کہ وہ اکثر ایسا کیا کرتے تھے۔

''کہیں اور تو چوٹ نہیں لگی تھی؟'' انہوں نے سگریٹ راکھ دان میں بجھاتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

''نہیں، اب ٹھیک ہوں۔'' وہ آہستہ سے بولی تھی، اس کی آنکھیں بند تھیں پھر اس نے ذرا سا سیدھا ہوتے ہوئے اپنا ہاتھ ان کے سینے پہ رکھ دیا، جہاں ان کا دل تھا، حیدر نے ایک نظر اسے دیکھا پھر اس کے ہاتھ کو جو سانس کی جنبش سے بہت مدہم سا اوپر نیچے ہو رہا تھا، وہ سو چکی تھی اور حیدر کے ماتھے پہ ایک شکن گہری ہوتی جاتی تھی۔

☆.....☆.....☆

اور ایک بار پھر وہ روتے ہوئے دارا کو کہانی سنا رہی تھی، جو گنگ سا اس کی باتیں سنی جاتا تھا اور بار بار بے یقینی سے یہی پوچھتا تھا۔

''کیا واقعی؟ انہوں نے ایسا کہا؟'' وہ آنسو بہاتے ہوئے سر ہلا کر اسے بتا رہی تھی کہ ہاں واقعی ایسا ہی کہا تھا۔

''پھر کیا ہوا؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا، کہانی اپنے عروج پر تھی اور درمیانی وقفہ اسے بالکل پسند نہ تھا۔

''پھر شہزادی نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور دیوزاد کے غضب کو آواز دے دی، وہ ہر روز ایک زہریلا تیر شہزادی کے جسم میں گھونپ دیتا، یہ اس کی سزا دی۔'' وہ زرد چہرے کے ساتھ انہیں بولتے ہوئے یوں محسوس کر رہا تھا جیسے وہ کیل اس کے جسم میں اتارے جا رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

بہترین طرز کے سلے ہوئے تھری پیس میں ٹائی لگائے ہاتھ میں موبائل تھامے داخلی گزرگاہ کی طرف جاتے ہوئے انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے ڈرائیور کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا تھا، وہ مستعدی سے دروازہ کھول کر ان کا منتظر تھا، انہوں نے اندر بیٹھتے ہوئے دروازہ بند کیا اور گاڑی چل پڑی، اس نے کھڑکی کی درز سے ان کو جاتے دیکھا اور مایوسی سے پیچھے ہٹ گئی، وہاں دور افق میں ایک وہ سمت تھی جس کے رخ کو اس کے گھر کا راستہ جاتا تھا۔

اور جہاں اس کی ماں تھی، اس کی آنکھوں میں ٹھہری سی نمی تھی، جو نہ بہتی تھی نہ جمتی تھی، بس کھڑے پانیوں کی طرح جامد تھی، وہ آنکھوں کو مسل کر اپنے بستر پہ آ گئی، وہ یہاں پر چار دن رکے تھے اور ان چار دنوں کی روداد

چار صدیوں پر محیط تھی۔

وہ اپنی ڈائری اور اپنے صفحات نکال لائی، کمرہ مقفل کیا اور پھر ایک بار پھر سے اس کی رکی انگلیاں حرکت میں آگئیں، کورے ورق بھرنے لگے اور جب اس کے ہاتھ رکے تو حیدر چوہدری کی ایک اور تصویر صفحہ قرطاس پہ نمودار ہو چکی تھی۔ ہو بہو حیدر کے نقش اور وہی ماتھے کی شکن اور اس کے پرتاثر آنکھیں پھر اس نے سرخ رنگ اٹھایا اور جب واپس رکھا تو حیدر کی آنکھوں میں وہی گہری سرخی تھی، اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور آنکھوں میں ٹھہری نمی مزید گہری ہو گئی۔

ہم کو تیری سرد مہری کی ہوا یخ کر گئی
اوڑھ کر احساس محرومی کی چادر سو گئے

پھر اس نے وہ ڈائری اٹھالی۔

"پتہ نہیں حیدر اسے اتنا کم عقل، جاہل اور غیر ذمہ دار کیوں تصور کرتے تھے، شاید اس لیے کہ وہ کم پڑھی لکھی تھی، صرف میٹرک پاس، مگر اس میں اس کا کیا قصور تھا، ابھی وہ اسی لحاظ سے کم عمر بھی تو تھی اور ابھی اگر امی اسے مزید پڑھنے کے لیے شہر میں لڑکیوں کے کالج بھجواتی تو وہ بھی ان کی طرح پڑھی لکھی اور سمجھدار بن جاتی شاید۔

مگر پھر اس کی شادی ہو گئی اور تب ہی اسے پتہ چلا کہ اس کا نام دراصل دارین نہیں تھا بلکہ جاہل، کم عقل، غیر ذمہ دار اور بے وقوف تھا، وہ کس قدر احمق تھی کیونکہ وہ ان کی طرح انگلش نہیں بولتی تھی۔

اس نے دم گھٹتے آنسوؤں کے ساتھ اپنے گال صاف کیے اور ذہن کو پیچھے کی طرف دوڑایا اور اسے ان کی ایک ایک بات یاد آ گئی، پھر اس کا قلم چلنے لگا، وہ ان کی وہ سب سنی ہوئی باتیں لکھ رہی تھی وہ سب باتیں جو انہوں نے دوسروں کے ساتھ کی تھیں، کیونکہ اس کے حصے میں ان کی توجہ نہیں آئی تھی، نہ ان کی باتیں آتی تھیں، اس کے حصے میں صرف خاموشیاں اور اندھیرے آئے تھے، وہ ان کی انگلش لکھ رہی تھی پھر وہ حیدر کی لائبریری سے انگلش کی بڑی سی ڈکشنری اٹھالائی جسے اس نے ٹانگوں پہ رکھ کر کھول لیا، اب وہ حیدر کی انگلش ٹرانسلیٹ کر رہی تھی ایک ایک لفظ کی اردو اور پھر بامحاورہ ترجمہ اور وہ باتیں کیا تھیں؟ ان کے آفس کے معاملات تھے، ان کی ذاتی باتیں تھیں اور ان کی باتوں میں کہیں پر وہ بھی تھی، اس کا قلم تھمنے لگا۔

مگر رات کے آخری پہر جب کے صحن میں دھند کے قافلے اتر رہے تھے اس نے اپنا کام مکمل کر لیا تھا۔

ایک بار پھر سے وہی معمول شروع ہو گیا، وہ اسی طرح جاگتی، ماں کا خیال رکھتی، گھریلو معاملات میں حصہ لیتی اور پھر رات کی تنہائی میں تکیہ بھینچ کر سو جاتی، حیدر نے کہا تھا وہ بے وقوف اور کم عقل تھی، وہ اپنی بے وقوفی کو کم کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ کتابیں پڑھتی، اس کے لیے حیدر کی لائبریری کام آتی تھی، جس میں دنیا زمانے کی ہر کتاب جمع تھی، کتابیں پڑھنے کا موقع اس کے پاس رات کو ہی میسر ہوتا تھا، جس میں اس نے ابتدائی طور پر انگلش کے ذخیرے میں سے شیکسپیئر کا ڈراما ہیملٹ اور اردو میں مستنصر حسین تارڑ کی ہنزہ داستان منتخب کی تھی، جس رات اس نے ہنزہ داستان ختم کی اس سے اگلے دن وہ بہت گم صم اور خیالوں میں گم رہی، اس کا دل چاہتا وہ بھاگ کر ہنزہ چلی جائے مگر اس کے گرد شیش محل کی فصلیں بہت مضبوط تھیں۔

اس رات ان دو کتابوں کو واپس رکھ کر اس نے اشفاق احمد کی زاویہ اور ایلف کشف کی فورٹی رولز آف نو اٹھالی، انگلش کی کتابیں وہ ہمیشہ ڈکشنری ساتھ رکھ کر پڑھتی تھی، اگرچہ اس کے باوجود اسے بہت سی چیزیں کنفیوژ کر دیتی تھیں، مگر پھر بھی یہ چیز اس کی دلچسپی کم نہیں کر پاتی تھی، وہ اپنے ذہن میں بنانے کی کوشش کرتی تھی اور اس کے بعد چھوٹے چھوٹے جملے اپنے ذہن میں بنانے کی کوشش کرتی تھی، اگر کسی چیز کی سمجھ نہ آتی وہ ڈکشنری سے تلفظ دیکھ کر لکھتی اور پھر اسے بولنے کی پریکٹس شروع کر دیتی، وہ غیر ارادی طور پر حیدر کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ وہ بھی ان کی بات سمجھ سکتی ہے۔

☆.....☆.....☆

''ہاں مجھے ایسی ہی بیوی چاہیے تھی، میرے انڈر رہنے والی جو آنکھ کے اشارے سے بات کو سمجھے اور مجھے اپنی عقل مندی دکھانے کی کوشش نہ کرے، مجھے تیز تیز بولنے والی بدتمیز لڑکیاں نہیں پسند۔'' ہلکی سی ہنسی، پھر قہقہہ

''اگر اس نے ایسا بننے کی کوشش کی تو میں اسے شوٹ کر دوں گا۔'' مذاق اڑاتا اور دھمکی دیتا انداز۔

''ہاں بیوی ایسی ہی اچھی لگتی ہے، آپ کے کاموں میں مصروف، اسے اس کے لیے وقت نہیں ملنا چاہیے ورنہ وہ اپنی حیثیت بھول جائے گی۔'' وہ پرغرور اور تکبر میں ڈوبا لہجہ۔

اس نے کانپتے ہاتھوں اور زرد چہرے کے ساتھ فلم نیچے رکھا اور بستر پر اوندھ گئی، اس کے سر میں دھماکے سے

ہو رہے تھے۔

تو حیدر چوہدری کے دارین اپنی بیوی کے متعلق یہ خیالات تھے، وہ سکتہ کی کیفیت میں تھی۔

☆.....☆.....☆

دن گزرتے جاتے تھے، اس دفعہ وہ بہت زیادہ مصروف تھے، گھر آ ہی نہ سکے ماں سے فون پر بات ہو جاتی اور بات تو اس سے بھی ہوتی تھی، وہ رسمی حال چال ہوں ہاں اور ماں کا خیال رکھنے کی تاکیدیں۔

وہ دم گھٹتے سانس اور جمے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ سنتی رہتی اور دل میں سوچتی وہ اس قابل نہ تھی کہ ان کی اولاد پیدا کر سکتی اس لیے اس نے ماں کو ہی اپنا بچہ سمجھ لیا تھا، انہیں نہلاتی دھلاتی، ان کے کپڑے بدلواتی، ان کے سر میں مالش کرتی، ان کو وضو کرواتی اور پھر ان کی وہیل چیئر دھکیل کر باہر لے جاتی، انہیں گھر کے کاموں میں شرکت کرنے کو کہتی اور پھر جب اس محل کے دیگر افراد جن میں سرفہرست فردوس خانم تھیں اس پر رشک کرتی تھیں اور اشاروں کنائیوں میں بیسوں بار ماں سے پوچھ چکی تھیں کہ خوشخبری کب دیں گے؟ ماں آگے سے خاموشی اختیار کر لیتی تھیں اور ان کی یہ خاموشی دارین کے اندر زہر سے بھرے کتنے ہی کیل گاڑ دیا کرتی تھی، نگینہ اور شبینہ اس سے پوچھتی تھیں کہ وہ اپنے گھر ماں سے ملنے کیوں نہیں جاتی اور اسے حیدر کا منہ توڑ انکار یاد آ جاتا، وہ کس قدر مضبوط تھی اس کا واقعی دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ گھر جائے اور یہ سوچ ہمیشہ اس کے اندر مزید درد بھر دیا کرتی، حیدر کے نزدیک ان کی ماں کس قدر ضروری تھیں کہ وہ لمحہ بھر کو بھی تنہا نہیں چھوڑنا گوارا کرتے تھے اور وہ کس قدر غیر اہم اور جذبات سے عاری تھی جو کہ گزشتہ گیارہ مہینوں سے اپنی ماں سے ملے بغیر زندہ تھی، واقعی وہ کس قدر سخت جان تھی، اس کی زندگی جیسے شیش محل میں ہی ختم تھی، وہ نگینہ شبینہ کو بڑے حوصلے سے کہا کرتی تھی کہ اب یہی اس کا گھر تھا، اب اس کا دل چاہتا تھا کہ ایک صبح آئے جب وہ سب جاگیں مگر وہ سوتی رہے اور پھر عیشاں اس کے کمرے میں آئے اسے یہ بتانے کہ آج اس کی وجہ سے ماں کی نماز قضا ہو گئی مگر اسے مردہ جان کر واپس دوڑ جائے اور پھر حیدر کو کتنا دکھ ہو کہ وہ اپنی سرخ آنکھوں کے ساتھ آخری بار ڈانٹ بھی نہ سکے اور پھر اس کی امی آ جائیں، اس کے کفن شدہ وجود سے لپٹ جائیں اور تب شاید اس کی جلتی روح کو سکون مل جائے اور جب حیدر اس کے جنازے کو کندھا دیں گے تب وہ کس قدر شانتی پائے گی کہ ساری زندگی اس شخص نے اسے اپنے پیروں میں رکھا مگر جب

وہ مرگئی تب اسے سر پہ اٹھانے پر مجبور ہو گئے اور پھر جب اسے دفنا دیا جائے گا اور جب اندھیاری قبر میں وہ تنہا رہ جائے گی تب فرشتے آئیں گے اس کا حساب لینے اور جب وہ سسک سسک کر انہیں اپنے وجود میں گڑے کیل اور زہریلی سوئیاں دکھائے گی رو رو کر انہیں اپنے دل کے زخم اور روح کی جلن دکھائے گی تب فرشتے بھی اس کے ساتھ رو دیں گے۔'' اور یکلخت اس کا قلم لرز گیا، اس نے سوچا اگر حیدر کو یہ سب پتہ چل جائے تو وہ اس کا کیا حشر کریں گے، اس نے جلدی جلدی ڈائری چھپا دی تھی۔

☆.....☆.....☆

اس نے چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے کھڑکی سے پار دیکھا، جہاں نوکروں کے کوارٹرز میں ڈھولک بج رہی تھی، آج فیضاں (ملازمہ) کی بڑی بیٹی کی رسم حنا تھی، ماں کو اتنے شور شرابے سے چڑ تھی، ان کا دل گھبراتا تھا جبھی انہوں نے سلیقے سے منع کر دیا تھا اور جب وہ نہیں جا رہی تھیں تو دارین کے جانے کا تو سوال ہی نہ تھا اور باقی سب جا رہے تھے، وہ خاموشی سے ماں کے پاس بیٹھی ان کی باتیں سنتی جاتی تھی، عیشاں بھی تو آج ہی اپنے گاؤں گئی تھی۔

''حیدر بچپن میں بہت شرارتی تھا، ہر وقت اپنے پیچھے دوڑاتا رہتا تھا، ڈر لگا رہتا تھا کہ اب گرا کہ تب، خوبصورت بھی بہت تھا، بہت جلد نظر لگ جاتی تھی، مجھے اتنا گھبرایا ہوا دیکھ کر اس کے بابا کہا کرتے تھے کہ تم سے ایک بچہ نہیں سنبھلتا اور میں کہتی تھی کہ اگر آپ میری جگہ ہوتے تو تب پوچھتی، کتنا بھاگنا پڑتا ہے اسکے پیچھے۔'' وہ مگن سی بول رہی تھیں۔

دارین نے لاپرواہی اور غیر دلچسپی سے ان کی بات سنی تھی اس کا سارا دھیان ڈھولک کی آواز پر تھا۔

''اور دیکھو اللہ نے مجھے اس کی ذمہ داری سے آزاد ہی کر دیا۔'' وہ افسردگی سے اپنی ٹانگوں کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی تھیں۔

''بہو خانم۔'' ان کو اس کی غیر دلچسپی دیکھ کر جیسے دکھ ہوا تھا۔

''جی ماں جی!'' وہ ہڑبڑا کر متوجہ ہوئی تھی، اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی بات شروع کرتیں دروازے سے نگینہ، شبینہ، فیضاں اور دیگر افراد اندر آ گئے، ان سب کے اصرار تھا کہ چھوٹی بی بی یعنی دارین کو ساتھ لے کر

جائیں گے، دارین نے بہتیرا انکار کیا مگر آخر کار ماں نے اسے جانے پہ آمادہ کر لیا اور جب ماں کا حکم تھا انہوں کہہ دیا تھا تو اس کے بعد وہ کچھ بول ہی نہ سکی تھی، اس لیے چپ چاپ اٹھ کر چلی گئی، کچھ دیر بعد وہ بہت خوبصورت ہلکے پیلے فراک میں ملبوس تھی، لڑکیوں نے شوق اور اصرار سے اس کی کلائیوں میں گجرے بھی پہنا دیئے تھے، جس سے اس کا روپ اور بھی کھل اٹھا تھا، وہ سب مل کر گیت گا رہی تھیں یہ پنجاب کے روایتی گیت تھے جو اس کی شادی پر بھی گائے گئے تھے۔

مگر آج جانے کیوں اسے رونا آ رہا تھا، اسے امی بے حد یاد آ رہی تھیں، پتہ نہیں زندگی ایسی کیوں تھی، کیا ساری شادی شدہ لڑکیاں اسی طرح اپنے والدین کے گھر جانے سے روک دی جاتی تھیں، اسے یاد تھا کہ اس کے ماموؤں کی بیٹیاں تو ان سے ملنے آیا کرتی تھیں اور ماموؤں کی بہویں بھی اپنے والدین کے ہاں رہنے جاتی تھیں پھر پتہ نہیں اس کی فعہ ہی کیوں سارے اصول وضوابط بدل گئے تھے۔

اس نے سر جھٹک کر اپنا دھیان کھانے میں لگانے کی کوشش کی تھی مگر دو نوالے کھا کر ہی اس نے چھوڑ دیا، اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا، اس نے بے دلی سے اِدھر اُدھر دیکھا سب مصروف تھے وہ دھیمے قدموں سے چلتی فیضاں کی بیٹی کے پاس آ کر بیٹھ گئی، فیضاں اس گھر کی پرانی ملازمہ تھی، اس کی اہمیت سے بخوبی آگاہ تھی جبھی اس کے پاس آ کر اس سے باتیں کرنے لگی، وہ نیم غائب دماغی سے اس کی باتیں سننے میں مگن تھی جب اس نے محسوس کیا یکدم ہلچل سی مچ گئی تھی، اس نے کھلی کھڑکی سے پار دیکھا، بیرونی گیٹ سے ایک گاڑی اندر آ رہی تھی، اس سے پہلے کہ وہ جان پاتی کہ گاڑی کس کی تھی ایک لڑکی کھڑکی کے آگے آ کر یوں کھڑی ہوئی کہ اسے بیرونی منظر نظر آنا بند ہو گیا، اسے بے چینی سی محسوس ہونے لگی، لڑکیاں اب دلہن کو مہندی لگا رہی تھیں کسی ایک نے لاڈ سے اس کیا بھی ہاتھ تھام لیا، اس نے بہت چاہا کہ ہاتھ چھڑا لے انکار بھی کیا مگر کسی نے بھی اس کی نہ سنی اور پھر اس کی ہتھیلی شاید ابھی آدھی ہوئی تھی کہ یکلخت جیسے کہرام مچ گیا، ایک ملازمہ دوڑتی ہوئی چلاتی ہوئی آ رہی تھی۔

''بڑی بیگم صاحبہ چلی گئیں، چوہدرانی جی وفات پا گئیں۔''

☆.....☆.....☆

اس کے ہلکے پیلے فراک پر مہندی کے داغ تھے اور اس کی کلائیوں کے گجرے بکھر گئے تھے اور وہاں پھولوں

کی جگہ صرف دھاگے تھے جو اس کی کلائیوں کے گرد ہتھ کڑی کی مانند لپٹے تھے، اس کی آنکھیں سوجی ہوئی متورم تھیں اور وہ زمین پر یوں بیٹھی تھی کہ اس کے زانوں ایک طرف جھک آئے تھے اور اس کے پیروں پہ مہندی کے داغ آسانی سے دیکھے جاسکتے تھے، یہ شیش محل کے بڑے کمرے کا منظر تھا اور وہاں کرسیوں پر بڑے بڑے افراد بیٹھے تھے جن کے چہرے تنے تھے اور جن کے ماتھے پر شکن تھے اور جن کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں پھوٹتی تھیں اور یہ سب کے سب وہ لوگ تھے جن کے ہاتھ میں اختیار تھا، فیصلے کا اختیار۔

اور ان سب کے درمیان وہ سنہری شہزادہ بھی فروکش تھا، جس کی آنکھوں سے کبھی اس نے روشنی کی کرنیں پھوٹتی دیکھیں تھیں، اسے یوں لگا آج سب ختم ہوگیا تھا، سب کچھ ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

آج الزام واضح تھا بلکہ نہیں جرم واضح تھا، اس رات جب دارین ماں کو تنہا چھوڑ کر گئی تو وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی قسمت اس کے ساتھ کیا کرنے جارہی تھی اور اس کی اک ننھی سی خواہش کیسے اس کے پیروں تلے سے زمین کھینچے گی وہ قطعاً لاعلم تھی۔

یہ پنچائیت حیدر چوہدری کے حکم پر بٹھائی گئی تھی جس کے مطابق دراین چوہدری پر الزام تھا کہ اس نے اپنی ساس یعنی زبیدہ خان کو سازش کے مطابق قتل کروالا تھا، سازش کچھ یوں تھی کہ اس نے جان بوجھ کر ملازمہ خاص عیشاں کو اس دن چھٹی پر بھیج دیا جبکہ وہ بخوبی آگاہ تھی کہ وہ دل کی مریضہ تھیں، دوسری طرف اسی رات وہ سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق انھیں ان کی دوا دیئے بغیر خود ملازمہ کی بیٹی کی شادی میں شرکت کے لیے چلی گئی۔

حیدر چوہدری کی طرف سے فرد جرم عائد کی گئی تھی کہ وہ چونکہ بخوبی آگاہ تھی کہ ان کی دوا کے اوقات کار کیا تھے اور چونکہ اس روز عیشاں بھی موجود نہ تھی تو اسے ان کے پاس رکنا چاہیے تھا اور اگر اسے جانا ہی تھا تو اسے چاہیے تھا کہ ان کی دوا دے کر جاتی اور سب سے خوفناک بات یہ تھی کہ جس وقت دارین وہاں رسم حنا میں موجود تھی، اسی دوران بن بتائے حیدر آگئے اور جو منظر ان کی آنکھوں نے دیکھا وہ ان کی روح تک کو لرزا گیا، ان کی پیاری ماں جن میں ان کی جان بند تھی، جن کو معمولی سی تکلیف پہنچنے پر وہ اتنے بے تاب ہوا کرتے تھے کہ اُڑ کر آنے کو تیار رہا کرتے تھے اب جو انہیں سرپرائز دینے کے چکر میں بن بتائے آئے تو جو سرپرائز نہیں ملا وہ بہت خوفناک تھا۔

ان کی پیاری ماں زمین پر گری ہوئی تھیں، دارین کے جانے کے بعد ایک دم طبیعت خراب ہونے پر جب انہوں نے گھنٹی بجانے کی کوشش کی تو اس میں ناکام رہیں، ان کا ہاتھ وہاں نہ جا سکا اور اس کوشش میں وہ بیڈ سے زمین پر گر گئیں اور اپنی زندگی بچانے کی ایک ناکام کوشش میں انہوں نے گھسیٹ کر دروازے تک جانے کی کوشش کی، وہ معذور تھیں، چل نہ سکتی تھیں اور اسی کوشش میں درمیان راہ میں انہوں نے جان جان آفرین کے سپرد کر دی تھی اور جب اس پر الزام ثابت ہو گیا تو پنچائیت کی طرف سے اسے صفائی کا موقع دیا گیا تھا، گھٹی گھٹی سسکیوں کے ساتھ وہ اپنی صفائی تو خاک دے پاتی بس یہی بولے چلی گئی کہ عیشاں کو ماں نے خود بھیجا تھا اس نے نہیں اجازت دی تھی، اس وضاحت پر فوری ردعمل دیا گیا تھا، عیشاں سے رابطہ کرنے کی کوشش کی گئی مگر اس کا نمبر بند تھا، صفائی کا کوئی راستہ نہ رہا، بچاؤ کی کوئی تدبیر نہ بچی اور اس کی زندگی کا فیصلہ سنا دیا گیا اور تب ہی تو اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہوئی تھی، اس کی ماں آئی تھیں اس کی امی جن سے ملنے کو اس کی روح تڑپتی تھی مگر ستم در ستم اس کی خواہش تا حال ادھوری رہ گئی، اسے اس کی ماں سے ملنے نہیں دیا گیا تھا، اس کی وجہ حیدر چوہدری کا فیصلہ تھا جس میں واضح تھا کہ کسی کو بھی اس سے ملنے کی اجازت نہ ہو گی اور پھر اسے اس تاریک کمرے میں بند کر دیا گیا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مگر اس سے پہلے اس کے وجود سے سارے زیورات اتروا لیے گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

حاصل زیست

درد اور تنہائی

اور اک سعی رائیگاں

اور تاریکی

اور اگر یہ مکافات عمل تھا تو

لاؤ.....سجاؤ دربار.....!

لگاؤ کٹہرا.....!!!

مجرم حاضر ہو.....!!!

اور مجرم حاضر کر دیا گیا، وہی کمرہ تھا، وہی ماحول تھا، وہی گھٹا ہوا اور بوجھل پن اور سنہری شہزادہ اپنے تخت پہ فروکش تھا، وہ دو دن سے اس کمرے میں قید تھی، اس کی آنکھوں کے گرد گہرے حلقے تھے اور اس کا رنگ زرد تھا، اس کا لباس میلا اور مسلا ہوا تھا، وہ بمشکل اپنے پیروں پہ کھڑی تھی اگر اسے دو ملازماؤں نے نہ تھاما ہوتا تو وہ کھڑی نہ ہو پاتی اور جب حیدر کے حکم پر ملازمائیں اسے چھوڑ کر کمرے سے نکل گئیں تو وہ پہلے ذرا سا لڑکھڑائی اور پھر زمین پر گر گئی، نقاہت اور کمزوری حد سے بڑھتی جا رہی تھی، کل رات اس نے باسی روٹی کے چند نوالے کھائے تھے اور تا حال اسے کھانے کو کچھ نہ دیا گیا تھا۔

اسی وقت دروازہ پھر سے کھلا اور شبینہ اندر آ گئی، اس نے دارین کو دیکھا اور اس کے چہرے پر عجیب سی نفرت ابھر آئی، وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ آئی اور پھر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

''مجھے افسوس ہے بھابھی بیگم آپ کی اک ذرا سی لاپروائی ہماری خالہ امی کی زندگی چھین کر لے گئی، اس رات خالہ امی نے بارہا ان کی منتیں کی تھیں کہ بہو خانم مت جاؤ، مجھے طبیعت میں کچھ گرانی سی محسوس ہوتی ہے، مگر آپ تو خدا جانے کون سے منصوبے پر تھیں، کس قدر تلخ اور روکھے لہجے میں آپ نے انہیں کہا تھا کہ۔''

''خدارا آپ پر زندگی کی خوشیاں تنگ مت کی جائیں آپ کون سا کہیں آتی جاتی ہیں، آپ کو تو اپنی امی کے گھر جانے کی اجازت بھی نہیں، اب آپ پر اور کتنا زندگی تنگ کی جائے گی؟ آپ نے واضح الفاظ میں بے رحمی سے اس کا ذمہ دار ماں کو ٹھہرا دیا تھا، کہ ان کی ذمہ داری کی وجہ سے ہی آپ کی زندگی اتنی سخت اور بے رونق ہے، پتہ نہیں آپ کی جان کب چھوڑیں گی؟ کب آپ کو رہائی ملے گی اور پھر اسی غصے میں آپ بن سنور کر رسم حنا میں چلی گئیں۔'' وہ خاموش ہو چکی تھی۔

حیدر کے چہرے پر حیرت اور بے یقینی ثبت تھی اور دارین کا چہرہ جھکا ہوا تھا، پھر اس نے سر اٹھایا اور شبینہ کو دیکھا۔''اس دن سے ڈریں شبینہ باجی جب اعمال نامے کھلے ہوں گے اور جب ہر جان دیکھ لے گی کہ اس نے آگے کیا بھیجا؟'' اس کی آواز میں ایسی غراہٹ تھی کہ لمحہ بھر کو حیدر بھی اسے دیکھتے رہ گئے۔

''جو بات سچ تھی وہ میں نے آپ کو بتا دی، سچ جھوٹ کا فیصلہ اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔'' وہ اس کو یکسر

نظر انداز کر کے حیدر سے مخاطب ہو کر بولی اور اٹھ کھڑی ہوئی، اس کے لہجے میں ایسا اعتماد تھا کہ دارین کے لفظ خالی اور کھوکھلے لگتے تھے۔

پھر وہ آہستہ آہستہ باہر نکل گئی، اس کے پیچھے دروازہ بند ہو گیا اور شاید اس کے ساتھ ہی دارین پر رحم و ترحم کا درواہ بھی بند ہو گیا تھا، وہ کسی تھکے ہوئے چوپائے کی مانند زمین پر گری تھی اور اس کا گلا خشک تھا اور اس کے لفظ ختم ہو چکے تھے۔

حیدر اپنی جگہ سے اٹھے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے پاس آ گئے، پھر انہوں نے کرسی نزدیک گھسیٹی اور اس پر بیٹھ گئے۔

''کیوں دارین؟ نفرت تھی تمہیں میری ماں سے؟'' ان کی آواز میں سرد مہری تھی، نفرت تھی اور سوال تھا، وہ خاموش رہی۔

''تمہیں آزادی چاہیے تھی اس زندگی سے اور اس آزادی کے لیے تم نے انہیں ہی زندگی کی قید سے آزاد کر دیا؟'' اس بار لہجہ زہر خند تھا۔

وہ اس بار بھی خاموش تھی، وہ سازش کا شکار ہو چکی تھی اس کی کم نصیبی یہاں بھی اس کے پیچھے تھی، اس کے لفظ ہمیشہ کے لیے گم ہو چکے تھے، وہ سردی کی شدت سے کانپ رہی تھی حیدر کا ہاتھ بڑھا اور اس نے دارین کے بال مٹھی میں جکڑ لیے، اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اس نے سسک کر حیدر کو دیکھا جس کا چہرہ بے رحمی اور درندگی کا مظہر تھا اور جس کی آنکھوں میں سرخی تھی۔

''مجھے تمہارا جواب چاہیے۔'' وہ شدت غضب سے پھنکارا تھا۔

''میں نے کچھ نہیں کیا، اللہ کی قسم میں بے گناہ ہوں۔'' وہ سسکتے ہوئے کہہ رہی تھی اس کے بالوں پر حیدر کی گرفت کچھ اور بڑھی تھی۔

''جھوٹ بولتی ہو تم۔'' الٹے ہاتھ کا تھپڑ اور دارین کی چیخ نکل گئی۔

''بولو..... سچ بولو..... صرف سچ۔'' اس کے سر کو جھٹکا دیتے ہوئے انہوں نے ایک اور تھپڑ اسے مارا، بالکل اضطراری طور پر دارین نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے اپنے ہاتھ منہ پر رکھنے کی کوشش کی تھی، مگر ایک جنونیت

کے عالم میں انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور پھر اسے اندازہ نہیں ہو سکا کہ اس کے ساتھ کیا بیتی؟ مگر یہ ہوا کہ اگلی صبح جب ملازمائیں اسے اٹھا کر لے کر گئیں تو وہ اپنے ہوش میں نہیں تھی اور جب ملازمہ بلقیس جو اس کے لیے مخصوص تھی اسے پانی پلانے آئی تو اس کی حالت دیکھ کر کانپ اٹھی، اس کا چہرہ بری طرح نوچا ہوا تھا اور اس کی ساری گردن جلی ہوئی تھی اسے سگریٹ سے داغا گیا تھا، وہ اسے کچھ دیر ہوش میں لانے کی کوشش کرتی رہی، اسے تیز بخار تھا، جو کہ یقیناً اس ٹھنڈے کمرے اور ناکافی سہولیات کی وجہ سے تھا اور جب اسے کچھ ہوش آیا تو اس نے اسے پانی پلایا اور پھر کچھ نوالے چاول کھلائے تھے وہ کراہ رہی تھی وہ بے تحاشا تکلیف میں تھی اور جب ذرا اس کی آنکھ کھلتی تو وہ اذیت سے تڑپنے لگتی، بلقیس کو بے حد افسوس ہو رہا تھا، اگرچہ جس دیہاتی ماحول سے اس کا تعلق تھا وہاں مار کھانا بھی عورت کے فرائض میں شمار ہوتا تھا، ہاتھ اٹھانا مرد اپنا حق سمجھتے تھے اور وہ خود اپنے شوہر سے مار کھا کر رات کو اس کی خدمت کر کے اگلے دن حویلی کام پر آ کر زخم سہلاتی رہتی، مگر اس نے یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ اسے دارین بی بی کبھی اپنے جیسی حالت میں ملیں گی، یہ بات حیران کن تھی اس کے لیے، وہ تو سمجھتی تھی کہ چوہدری صاحب پڑھے لکھے تھے، سرکار کے ملازم تھے، وہ بھلا کہاں کچھ ایسا کرتے ہوں گے مگر دارین بی بی کی حالت دیکھ کر اسے احساس ہوا تھا کہ تمام مرد ایک ہی جیسے ہوتے ہیں، وہ جتنا بھی پڑھ لکھ جائیں کتنے بڑے افسر کیوں نہ بن جائیں ان کی جبلت نہیں بدلتی، وہ بڑے دکھ سے ایک پرانا کمل دارین کو اوڑھا کر دروازہ بند کر کے باہر نکل گئی، چونکہ دارین غنودگی میں جا چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

اور ایک بار پھر دارا اس کے پاس تھا، وہ روتی جاتی تھی اور وہ بار بار اس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر اسے خاموش کرواتا تھا اور اس کا ہاتھ تھام کر اسے تسلی دیتا تھا، مگر ظاہر ہے یہ سب بے سود تھا اور اس کی حالت دیکھ کر تو دارا بھی رونے لگا تھا۔

"میں تمہیں یہاں نہیں رہنے دوں گا، چلو میرے ساتھ۔" وہ اسے ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہا تھا، وہ روتی ہوئی ہاتھ چھڑانے لگی۔

"وہ مجھے مار ڈالیں گے مگر یہاں سے نہیں جانے دیں گے۔" وہ خوفزدہ تھی۔

''کچھ نہیں ہوگا، میں سب کو دیکھ لوں گا۔'' وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے عزم سے بولا تھا، اس نے دیکھا وہ معصوم اور ننھا سا، اس کے آنسو کچھ اور بھی تیزی سے بہنے لگے۔

''نہیں دارا میرے بھائی تم ابھی بہت چھوٹے ہو، تم ان لوگوں کو اور ان کی درندگی کو نہیں جانتے۔'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر رو رہی تھی۔

''بس کرو دوراین، تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔'' وہ ہٹ دھرمی سے اس کا بازو کھینچ کر بولا تھا۔

''دارا، خدا کے لیے جاؤ، کوئی دیکھ لے گا۔'' وہ منت کرنے لگی تھی، وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ پہلے ہی حیدر چوہدری وہاں تھے، وہ دروازے میں کھڑے خاموشی سے یہ تماشا دیکھتے رہے پھر واپس پلٹ گئے۔

☆......☆......☆

''شیش محل'' سے جانے والا تفتیشی فون اور حیرت انگیز جواب تھا، دارین اکلوتی تھی اور اس کا کوئی بھائی نہیں تھا، ماموں زاد سب اس سے عمر میں بڑے تھے اور ان میں سے بھی کوئی دارا نام کا شخص موجود نہ تھا اور اگلے دن پھر سے اس کی پیشی تھی، وہ ایک بار پھر وہاں تھی، دارین کی حالت آج کل سے زیادہ بری تھی، وہ ایک بار پھر زمین پر بیٹھی تھی اور ادھر سے ادھر چکر لگاتے حیدر چوہدری نے ایک سرسری نگاہ اس پر ڈالی تھی، پھر گئے، اسے کچھ دیر دیکھتے رہے۔

''کل تم کس سے باتیں کر رہی تھیں دارین؟'' اس کا لہجہ کرخت تھا، دارین نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔

''کسی سے بھی نہیں۔'' وہ آہستہ سے بولی تھی، حیدر نے دیکھا اس کے چہرے پر حقیقی حیرانی تھی، یا تو وہ سچ کہہ رہی تھی یا پھر وہ واقعی باکمال اداکارہ تھی کہ ایک بار تو ان جیسا زیرک شخص بھی مشکل میں پڑ گیا تھا۔

''یہ دارا کون ہے؟'' انہوں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا تھا۔

''کک......کون دارا؟'' اس بار حیرانی زیادہ تھی اور اس میں خوف کی آمیزش تھی۔

''جھوٹ بول رہی ہو پھر سے؟'' وہ دھاڑ اٹھے، مگر دارین آج اور زیادہ ڈر گئی تھی۔

''مجھے نہیں پتہ، میں کسی دارا کو نہیں جانتی، میں جھوٹ نہیں بول رہی۔'' وہ گھبرا کر وضاحتیں دینے لگی، حیدر الجھ گئے، عجیب بات تھی، کل انہوں نے خود اسے باتیں کرتے دیکھا اور آج وہ صاف انکار کر رہی تھی۔

''تو پھر کل کس سے باتیں کر رہی تھیں؟'' وہ اس کے سر پر آ کر کھڑے ہو گئے۔

''میں نے کب باتیں کی ہیں، مجھے نہیں پتہ آپ بار بار مجھے کیوں کہہ رہے ہیں ایسے؟'' وہ خوف و حیرانی کے ملے جلے لہجے میں بولتی آخر رونے لگی، وہ چند لمحے اسے جانچنے والی نظروں سے دیکھتے رہے پھر اسے ملازمین کے ساتھ واپس بھجوا دیا گیا مگر اندر سے وہ خود الجھ رہے تھے۔

اسی شام ملازمہ بلقیس اس کا لباس لینے کے لیے آئی تو کمرے میں چوہدری صاحب موجود نہ تھے، اس نے شکر مناتے ہوئے لباس نکالا اور یکلخت چونک گئی، وہاں تین ڈائریز اور ڈھیر سارے صفحات تھے اس نے یہ سمجھا کہ شاید وہ چوہدری صاحب کے ضروری کاغذ تھے، جبھی اس نے سارا پلندہ اکٹھا کیا اور ان کی میز پر رکھ دیا، اسی وقت دروازہ کھول کر حیدر اندر آ گئے، وہ انہیں دیکھ کر قدرے گھبرا گئی۔

''وہ چوہدری جی یہ آپ کے کاغذ غلطی سے دارین بی بی کی الماری میں چلے گئے تھے، میں نے یہاں رکھ دیئے ہیں، میں ان کے کپڑے لینے آئی تھی۔'' وہ جلدی جلدی وضاحتیں دینے لگی، انہوں نے دھیان دیئے بغیر اسے جانے کا اشارہ کیا تھا۔

وہ موبائل پر کوئی نمبر ملانے لگے، انہیں اپنی چھٹی بڑھوانی تھی، ماں کے دسویں سے تک وہ یہیں رکنا چاہ رہے تھے، دو تین فون کرنے کے بعد وہ تھکے ہوئے انداز میں لکھنے کی میز پر آن بیٹھے، ذہنی و جسمانی تھکن نے انہیں نڈھال کیا ہوا تھا، کچھ دیر وہ سر ٹکا کر آنکھیں بند کر کے بیٹھے رہے پھر سیدھے ہو کر اپنے سامنے پڑے کاغذات کی طرف متوجہ ہو گئے، پھر چونک سے گئے، سامنے پڑے کاغذات اور ڈائریز تو ان کی نہ تھیں، انہوں نے کچھ تجسس کے عالم میں صفحات کو الٹا اور پھر بے ساختہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

یہ کچی پنسل سے بنایا گیا ایک خوبصورت اسکیچ تھا، مگر جس چیز نے ان کے پیروں تلے سے زمین کھینچی تھی وہ ان کی اپنی تصویر تھی، وہ چند لمحے الجھی و حیران نظروں سے اپنے ہاتھوں میں تھامے اس صفحے کو دیکھتے رہے پھر اسے نیچے رکھ کر باقی صفحات کو دیکھنے لگے اور ہر صفحے نے ان کے سر پر حیرت کا ایک پہاڑ گرایا تھا، انہوں نے تیزی سے ڈائری کھول لی، پہلے صفحے نے ہی ان کو ہلا کر رکھ دیا تھا، وہاں بڑی خوبصورت لکھائی میں درج تھا۔

''دارا اور دارین۔''

یہ یقیناً دارین کی ڈائری تھی اور ان کے سامنے وہ کس قدر معصومیت سے اور صفائی سے مکر گئی تھی، انہیں اس کی اداکاری یاد آئی تو خون کھول اٹھا، اب وہ تیزی سے صفحے پلٹ رہے تھے اور ہر صفحہ ان کے لیے ایک نیا باب کھول رہا تھا، ہر لفظ اک نئی کہانی آغاز تھا۔

☆.....☆.....☆

آدھی سے مارے ہیں

آدھی سے ڈرتے ہیں

کہیں دور موذن فجر کی اذان دے رہا تھا، جب انہوں نے تیسری اور آخری ڈائری بند کی، ان کی آنکھوں میں گہری سرخی اتری ہوئی تھی، اگر دور کہیں آسمانوں پہ فرشتے نامہ اعمال لکھتے اگر ان صفحات کو پڑھتے تو حیران ہوتے کہ اس نے ان کی خدمت میں ایک اور نامہ اعمال پیش کر دیا تھا۔

ان کا نامہ اعمال، شادی کے بعد دارین کے اک اک احساس کی روداد اور اذیت خانے میں بسر کی گئی وہ درد بھری راتیں، اس کے کرب، اس کے آنسو، اس کے بے رنگ خواب، سب کچھ ان کے سامنے تھا، وہ بھی تو ان کے سامنے تھی۔

انہوں نے بے یقینی سے اس کا ماتھا چھوا، وہ سو رہی تھی، بالکل بے خبر بے سدھ اور اور وہ یک ٹک اسے دیکھے جاتے تھے، پھر وہ اٹھے تھے اور وہاں سے چلے گئے مگر کوئی آنکھ نہ دیکھ سکی کہ ان کے پیروں پہ کیسی بیڑیاں پڑ چکی تھیں اور ان کی روح کے گرد کیسے آسیب لپٹ چکے تھے۔

☆.....☆.....☆

سب کچھ ٹھیک نہیں تھا، سب ٹھیک ہو ہی نہیں سکتا تھا، جب اس کی طرف سے کوئی کمی کوتاہی نہ تھی تو پھر آخر اس کے ساتھ یہ کیوں ہوا تھا، وہ پہروں سوچتی رہی اور اگر بلقیس نہ ہوتی تو کیا بنتا، وہ صرف ملازمہ نہیں تھی، وہ اس قید تنہائی میں اس کے لیے ہوا کا اکلوتا روزن تھی، وہ اس کے لیے کھانا لاتی تھی اور اسے باہر کی ساری خبریں دیتی تھیں، وہ اس کی ہمدرد تھی اور کسی حد تک اس پر ترس بھی کھاتی تھی۔

اور جب اس نے دارین کو بتایا تھا کہ چوہدری صاحب کل واپس چلے گئے تو دارین کی آنکھوں میں

اندھیرے اتر آئے تھے، اسے پتا تھا اب اس کے کئی مہینے اسی قید خانے میں گزرنے والے تھے اور یہ کس قدر اذیت تھی کہ اس کو اب مزید کسی صفائی کا موقع نہیں ملنے والا تھا، اسے پتہ تھا کہ اب مزید کوئی اپیل نہیں کام آسکی تھی اور نہ ہی وہ اب کبھی کسی کو دیکھ پائے گی، وہ خوف زدگی کے عالم میں دیوار سے پشت ٹکائے سوچتی رہی، تو کیا اب ہر دروازہ اس پر بند کر دیا تھا، وہ بے یقینی سے بند دروازے کو دیکھتی۔

بلقیس آئی تو اسے روتا دیکھ کر مزید افسردہ ہوگئی، وہ جتنی بھی تسلی دے لیتی، وہ جانتی تھی یہ سب بے کار تھا، وہ اس کا دھیان بٹانے کو اسے بتانے لگی کہ کل زبیدہ خانم یعنی بڑی بی بی کا دسواں تھا مگر چوہدری صاحب یہاں سے جا چکے تھے، شیش محل سے سب لوگ ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر فی الحال کسی کا بھی رابطہ نہ ہو پا رہا تھا۔ وہ یہ ساری گفتگو بے یقینی سے سنتی رہی، بھلا ایسے ممکن تھا کہ وہ ماں کے دسویں میں شامل نہ ہو پاتے۔

اور اگلی صبح یہ سچ بھی ہو گیا، وہ واقعی نہیں آئے، دارین بند کمرے میں نوافل ادا کرتی مسلسل روتی رہی تھی، اور اللہ کے آگے ہاتھ پھیلا کر روتی ہوئی وہ سوچتی تھی کہ یقیناً اس سے کوئی جانے انجانے میں ایسا گناہ اور ناپسندیدہ عمل ہو گیا تھا جس کی اسے سزا مل رہی تھی، ورنہ اللہ تو اس قدر مہربان تھا کہ اس کی رحمتوں کے بے کنار سمندر کا ایک قطرہ بلقیس کی صورت میں اب بھی اسے میسر تھا، وہ گڑگڑاتے ہوئے اللہ سے دعا مانگتی رہی کہ صرف اللہ پاک ہی اس راز سے آگاہ تھا کہ وہ بے گناہ تھی اور صرف وہ پاک ذات یکتا و کامل ہی اسے دوسروں کے آگے بے گناہ ثابت کروا سکتی تھی۔

اگرچہ ابھی اس کے زخم تازہ تھے، اس کے چہرہ اور اس کی گردن میں درد کی ٹھیس اٹھتی تھیں، زخم گہرے تھے، بلقیس کی لگائی گئی مرہم بڑی سستی سے اپنا کام کرتی تھی اور شاید ان زخموں کو بھرتے کئی دن گزر جاتے، رات کو بلقیس اس کے لیے ختم کے چاول لے کر آئی تو دارین دھاڑیں مار مار کر رونے لگی، وہ بار بار دروازے کی طرف لپکتی تھی۔

"مجھے میری اماں کے پاس جانے دو بلقیس، تمہیں اللہ کا واسطہ، میں نے دو سال سے ان کا چہرہ نہیں دیکھا، مجھے ایک بار ان سے ملنے دو"۔ وہ تڑپ تڑپ کر روتی رہی، یہاں تک کہ بے سدھ ہو کر گر پڑی۔

☆.....☆.....☆

رات بڑی کرب ناک تھی، وہ راتوں کو تڑپ تڑپ کر روتی تھی، اسے تنہائی اور تاریکی ڈراتی تھی اور ان درد بھری ساعتوں میں اس کے پاس کوئی غمگسار، کوئی ہمدرد نہ تھا، مستزاد آج لائٹ چلی گئی، وہ گھٹی گھٹی چیخوں کے ساتھ دروازے کی طرف لپکی اور سرد ہاتھوں سے دروازہ پیٹنے لگی۔

''بہت اندھیرا ہے خدارا، ذرا سی روشنی چاہیے، روشنی کر دیجئے، کوئی ہے میری پکار سننے والا، کوئی ہے؟'' وہ روتے ہوئے چلا رہی تھی، مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہ تھا، رہائشی عمارت یہاں سے بہت دور تھی، وہ اگر چیخ چیخ کر مر بھی جاتی تو کسی کو پتہ نہ چلتا، وہ دروازے کے قریب زمین پر بیٹھ کر سسکنے لگی، خوف اور وحشت سے اس کی جان نکل رہی تھی۔

وہ سر گھٹنوں میں دے کر رونے لگی، یوں لگتا تھا کائنات اندھیروں میں ڈوب گئی تھی، اتنی تاریکی، کہ اس نے محسوس کیا کہ جیسے اس کا دل پھٹ جائے گا، جب یکلخت دروازہ کھلا تھا، وہ ہڑبڑا کر سیدھی ہوئی، شاید کسی نے اس کی پکار سن لی تھی، کسی کو اس پر رحم آ گیا تھا، اس گھور اندھیرے میں اس نے ایک سائے کو اندر آتے دیکھا، وہ ڈری ڈری سی نظروں سے سر اٹھا کر دیکھنے لگی، لائٹر کی چٹک کے ساتھ ہی سنہرا ایک شعلہ چمکا اور حیدر چوہدری کا چہرہ اس سنہری روشنی میں دمک اٹھا تھا، وہ لحظہ بھر کو ساکت ہوئی، اس کے آنسو بھی تھمے، پھر وہ ایک انجانے احساس اور نامعلوم طاقت سے اٹھی اور بھاگتی ہوئی ان کے ٹانگ سے لپٹ گئی۔

''مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا (سسکیاں) مجھے یہاں نہیں رہنا، مجھے اندھیرے ڈراتے ہیں، مجھے یہاں سے لے جائیں۔'' وہ ان کی ٹانگ سے مضبوطی سے لپٹی روئے جا رہی تھی اور اس کا بدن خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزتا تھا۔

مگر وہ اسی طرح خاموش کھڑے تھے، وہ روتی جاتی تھی مگر وہ کچھ نہ بولے، پھر ان کا ہاتھ آگے بڑھا اور اس سے پہلے کہ وہ اسے خود سے الگ کرتے وہ بے سدھ ہو کر زمین پر آ گری۔

☆.....☆.....☆

سنبھالا لا ہوش ہے جب سے
مقدر سخت تر نکلا.....!!!

پڑا ہے واسطہ جس سے

وہی تیر و تبر نکلا.....!!!

اس کی آنکھ کھلی تو وہ بہت جانی پہچانی جگہ پر تھی، یہ چھت، قمقمے بھاری پردے اور مانوس ماحول، یہ حیدر چوہدری کا کمرہ تھا، جہاں ڈیڑھ سال اس نے مالکن بن کر گزارے تھے، مگر اب حیثیت بدل چکی تھی، بھلا اب وہ کس حیثیت سے ادھر تھی، اس نے سوچا اور پھر ایک ہی سوچ اسے سمجھ آئی، وہ انتقام کی وجہ سے یہاں لائی گئی تھی، مگر پھر اسے زمین پر ہونا چاہیے تھا، وہ اس بستر پر کیوں تھی؟ جس پر اس کا حق ختم ہو گیا تھا، اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی مگر کمرہ خالی تھا، وہ اٹھ کر بھاگ جانا چاہتی تھی مگر ایک چیز اس کو راہ میں رکاوٹ تھی، اس کے ہاتھ میں لگی ڈرپ کی سوئی اور اسٹینڈ پر لٹکتی بوتل۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں، اسے کیا ہوا تھا؟ اسے یہاں کیوں لایا گیا تھا؟ وہ سوچنے لگی مگر فی الوقت اس کے پاس کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اسے جواب دے سکتا۔

☆.....☆.....☆

گاڑی گیٹ سے نکل کر ابھی کچھ دور ہی گئی تھی جب یکلخت ڈرائیو نے زوردار طریقے سے بریک لگایا، انہوں نے باہر دیکھا تو ایک عورت گاڑی کے آگے کھڑی تھی، جو کہ نجانے کہاں سے نکل کر سامنے آ گئی تھی اور لازماً اسی کی وجہ سے یوں اچانک بریک لگانا پڑی تھی، وہ عورت اب بھاگ کر ان کی طرف آئی اور کار کا شیشہ بجانے لگی، انہوں نے کچھ الجھ کر شیشہ نیچے کیا تو اس نے فوراً اپنی چادر چہرے سے ہٹا دی اور انہیں یہ دیکھ کر جھٹکا لگا کہ وہ عیشاں تھی۔

اس نے تیزی سے ہاتھ ماتھے تک لے جا کر انہیں سلام کیا اور پھر گھبرائی سی بولی تھی۔

''چوہدری جی! مجھے آپ سے ضروری بات کرنا ہے، یہ لوگ مجھے اندر نہیں جانے دیتے، فردوس بی بی نے حکم دیا ہے، میں کل بھی آئی تھی مگر مجھے اندر نہیں جانے دیا گیا، مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے۔'' وہ تیز تیز بولتی چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

معاملات کا الجھاؤ مزید بڑھ گیا تھا، اب کی بار بلائی جانے والی پنچائیت میں ہنگامی فیصلے تھے، عیشاں کے

بیان نے ساری بازی پلٹ دی تھی، فردوس خانم کی گہری اور بے داغ سازش، دارین پر الزام لگوا کر اسے راستے سے ہٹانا۔

شبینہ کو حیدر کی زندگی میں داخل کر کے اس پوری جائیداد کا مالک بن بیٹھنا، عیشاں کو اس کے گاؤں بھجوانا اور ہر صورت حیدر سے رابطہ نہ ہونے دینا، اس سازش کی ناکامی کو کوئی امکان ہی نہ تھا، کیونکہ زبیدہ خانم مر چکی تھیں، دارین کو سزا سنائی جا چکی تھی اور رہی عیشاں تو اس کا شیش محل میں داخلہ ممنوع کر دیا گیا، حیدر چوہدری تک لازماً وہی کچھ پہنچتا جو وہ چاہتی تھیں، اگرچہ زبیدہ خاتون کی موت میں ان کا کوئی ہاتھ نہ تھا مگر بعد والے واقعات کا سرا ان سے جا ملتا تھا، جن کو انہوں نے بڑی مہارت سے اپنے حق میں کیا تھا، مگر وہ جو اللہ کہتا ہے نا

''اور اللہ سب سے بہتر حکمت والا ہے۔'' القرآن۔

تو اسی کے مصداق اس نے سب کی چالوں اور تدبیروں کو الٹ دیا تھا، حیدر چوہدری نے دارین کے حوالے سے اپنی کھائی ہوئی قسم کا کفارہ ادا کیا تھا اور دارین کو بے گناہ قرار دے دیا گیا، فردوس خانم کو جائیداد میں ان کا حصہ دے کر شیش محل سے رخصت کر دیا گیا۔

اور پھر ایک بار پھر سب ملازمین اور ملازماؤں نے جشن کی تیاری شروع کر دی، اسے دلہن بنایا جا رہا تھا، وہ اب پھر سے حیدر چوہدری کی زندگی میں شامل ہو گئی تھی، اسے اس جشن کے لیے سجایا سنوارا گیا تھا اور وہ سکتہ زدہ تھی، جب ایک شور سا مچا تھا، پتہ چلا کہ دارین کی والدہ آئی تھیں وہ ان کے سینے سے لگی تو سکتہ ٹوٹ گیا۔

''امی!'' اس کی دلخراش چیخ سے در و دیوار تک لرز اٹھے۔

''میرا کیا قصور تھا؟ مجھے کیوں ایسے خود سے دور کر دیا تھا امی، میں روندی گئی، میں ٹھکرائی گئی۔'' وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔

''اس شخص نے مجھے پیروں کی دھول کر دیا، میری تربیت کو گالی دی امی، میں سب برداشت کرتی رہی، میں نے کھانا کھانا چھوڑ دیا، اس خوف سے کہ مجھے کوئی ندیدہ اور بھوکا نہ سمجھ لے، میں نے ہنسنا بولنا چھوڑ دیا اس ڈر سے کہ کہیں مجھے بدتمیز نہ سمجھا جائے، میں نے راتوں کو سونا چھوڑ دیا اس ڈر سے کہ کہیں مجھے غیر ذمہ دار نہ سمجھ لیا جائے۔'' وہ تڑپ رہی تھی اور وہ اسے سنبھالتے ہوئے نڈھال ہوئی جاتی تھیں۔

''میں ملازمہ بن گئی تھی شاید اس سے بھی بدتر، ان کو بھی تین وقت کھانا ملتا تھا اور میں یہاں بھوکی سوتی تھی۔ اور وہ شخص بے خبر تھا، وہ شخص جسے آپ نے میرا مالک اور میرا کفیل بنایا تھا، اسے خبر نہیں تھی، وہ بے خبر تھا۔''

''مجھے کسی سے ملنے نہیں دیتا تھا کہتا تھا، میری ماں کو تمہاری ضرورت ہے، تو میرا کیا، مجھے کسی کی ضرورت نہیں تھی کیا؟ میری ماں کو تو زندہ جیتے جی میرے لیے مردہ کر دیا اس نے۔''

''مجھے ترسا دیا گیا آپ سے ملنے کے لیے، مگر میں نے ضبط کا بندھن نہ ٹوٹنے دیا خاموشی سے سہتی رہی اور وہ مجھے ذلیل کرتا رہا، مجھے کہا گیا میں لاپرواہ اور غیر ذمہ دار ہوں، آپ نے کیا بنایا تھا اسے شوہر تھا نا وہ میرا، کل گن کے اس نے ڈیڑھ سال میں سترہ دن دیئے ہیں مجھے، اور بس مجھ سے بہتر اس محل کی ملازمائیں تھیں، یہاں کی چاکری کرتی تھیں اور رات کو اپنے شوہروں کے پاس چلی جاتی تھیں جو ان سے ان کا حال تو پوچھتے تھے، میرا کیا؟ میں تو ایسی ملازمہ تھی جسے رات ہوتے ہی اس کمرے میں قید کر دیا جاتا تھا اور میرا تو کوئی حال پوچھنے بھی نہ آتا تھا، مجھے کس گناہ کی سزا ملی امی؟'' وہ روتی جاتی تھی اور بولتی جاتی تھی اور اس بار سکتہ میں جانے کی باری ان کی تھی۔

''میری کم عمری کو میری غلطی اور میری کم علمی کو میرا گناہ بنا دیا اس نے۔'' وہ سسکتی تھی، وہ گم صم سی اس کا سر سہلاتی رہیں۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا دارین۔'' ان کا لہجہ امید سے خالی تھا اور جواباً وہ کچھ نہ بولتی تھی، بس خاموشی سے اپنی سسکیاں دبائی تھیں۔

☆.....☆.....☆

مرکزی بڑے گیٹ کے پاس وہ انہیں چھوڑنے آئے تھے، انہوں نے سنہری بالوں والے شاندار سے شخص کو دیکھا، وہ ان کا انتخاب تھا، پھر انہوں نے آہستگی سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''تم میرا انتخاب ہو اور مجھے یقین تھا کہ میرا انتخاب غلط نہیں ہو سکتا، میں نے تمہیں قصوروار نہیں ٹھہرایا، مگر میں تمہیں یہ ضرور کہوں گی اسے عام لڑکی مت سمجھنا، اس کے پاس رشتے نہیں تھے، تمہیں کچھ نہیں معلوم کہ اس نے تم میں کون کون سے رشتے تلاش کرنے کی کوشش کی تھی، اس نے باپ نہیں دیکھا تھا، اس کا کوئی بہن بھائی نہیں

تھا، بچپن سے ہی اکیلی رہی تھی، تمہیں اس میں جو بھی خرابیاں نظر آئیں شاید اسی وجہ سے تھیں۔'' وہ اپنے آنسو ضبط کر رہی تھیں۔

''تم ایک بہترین مرد ہو، مجھے یقین ہے تم اسے سنبھال لو گے، کیونکہ تم میرا انتخاب ہو اور ایک ماں کا انتخاب کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔'' انہوں نے آخری بار اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا وہ خاموشی سے انہیں دیکھتے رہے۔

''مجھے یقین ہے تم اس کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو نظر انداز کر دو گے اور میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ اگر تم اس سے نرمی برتو گے تو اسے مکمل طور پر بدلا ہوا پاؤ گے، وہ مایوس ہے حیدر، بہت دکھی ہے، تم اس کی امید بن جاؤ۔'' وہ اپنے آنسو نہ روک سکیں۔

''میں آپ کو کوئی دلاسہ تو نہیں دوں گا، نہ کوئی وعدہ کروں گا، مگر مجھے امید ہے جلد ہی آپ حالات کو بدلا ہوا دیکھیں گی، میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا، یہاں اکیلا نہیں رہنے دوں گا۔'' انہوں نے پرامید لہجے میں کہا تھا اور وہ ان کے انداز سے پہچان گئی تھیں کہ اگرچہ وہ وعدہ نہیں کر رہا تھا مگر یہ انداز کئی وعدوں پر بھاری تھا، وہ اس کا کندھا تھپتھپایا کر گاڑی میں بیٹھ گئیں۔

☆.....☆.....☆

کاش تم میرے دوست ہوتے
سچے اور مخلص دوست!
میں تم سے ڈھیروں باتیں کرتی
جنہیں تم اکتائے بغیر سنتے
میں تمہیں تنگ کرتی اور تم
ناراض ہوئے بغیر میری
بے وقوفیوں کو جان کر بھی
میرا ساتھ دیتے.....!
میرا ساتھ ہنستے.....!

کاش تم میرے دوست ہوتے!
اور کاش.....اے کاش!
تمہیں دل دکھانا نہ آتا
سنگدلی اور ناراضی سے
تمہارا کوئی واسطہ نہ ہوتا
محبت اور نرم دلی تمہارا
دم بھرتے.....!!!
مہربانی اور احساس تم
سے لپٹے ہوتے.....!!!
عشق اور پیار.....!
تمہاری دلربائی ہوتے
اور ان تمام خوبصورتیوں سے
سجے تم میرے دوست ہوئے!!!

☆.....☆.....☆

وہ بستر پر کروٹ کے بل پر دراز تھی، اس کے بال ایک طرف پھیلے ہوئے تھے اور وہ کہنی سر کے نیچے رکھے ہوئے بند آنکھوں سے کچھ سطریں اپنے ذہن میں لکھتی تھی، پھر انہیں مٹاتی تھی، پھر لکھتی تھی، ترتیب کچھ خراب تھی، اسے الجھن سی ہونے لگی، اس نے آنکھیں کھول دیں، وہ دروازہ بند کر کے اسکے پاس آرہے تھے، ردھم ٹوٹ چکا تھا، پتہ نہیں زندگی میں اس شخص کی وجہ سے اس کا اور کیا ٹوٹنا باقی ہے، اس نے تلخی سے سوچا۔

وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئے، پھر انہوں نے آہستگی سے ہاتھ اس کے بالوں پر پھیرا، وہ اب روکھے اور بے جان نظر آتے تھے، انہوں نے نرمی سے اس کا سر اپنی گود میں رکھا اور اس کی کہنی سر کے نیچے نکال دی، پھر کمبل کھینچ کر اسے اوڑھا دیا۔

''نیند آرہی ہے؟'' وہ آہستہ سے پوچھ رہے تھے، وہ جواب دینے کی بجائے ایک کہنی اپنے گال اور آنکھوں پہ رکھ رہی تھی۔

''جی۔'' جب جواب نہ دینا ہو اور پھر بھی بولنا پڑے تب دل تو دکھتا ہے اور اسی لیے اس کا جواب بھی بڑا مختصر تھا۔ وہ اسے تھپکنے لگے، دارین کے اندر بڑی شدت کی مزاحمت جاگی تھی، اس کا دل چاہا وہ انہیں روک دے، وہ کوئی بچی تو نہیں تھی نا، اب وہ آہستہ آہستہ اس کی کمر سہلا رہے تھے، اس نے بے چین ہوتے ہوئے کروٹ لینا چاہی مگر ایسا کرنے کے لیے اسے اپنے چہرے سے اپنی کہنی ہٹانا پڑتی اور پھر اس کی آنکھوں سرخ ہو جاتیں اور پھر..... وہ بے آواز رو رہی تھی۔

وہ بے وقوف اس بات سے بے خبر تھی کہ اس کا سر جس آغوش میں تھا، وہ بھیگتی جاتی تھی اور جو ہاتھ سے اسے تھپکتا تھا اس میں لرزش بڑھتی جاتی تھی، بہت دیر تک یہ جاری نہ رہ سکا، انہوں نے اس کا بازو اسکے چہرے سے ہٹایا اور اس کے آنسو صاف کرنے لگے، دارین کے لیے یہ ایک دھماکے سے کم نہ تھا، وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں نم تھیں۔

وہ یک ٹک اسے دیکھ رہے تھے، پھر انہوں نے اسے دونوں شانوں سے تھام کر اپنے قریب کر لیا، وہ پیچھے ہٹنا چاہتی تھی مگر وہی بات، ان کے سامنے اتنی جرات کہاں سے لاتی، جبھی بے بسی سے رونے لگی، اب کی بار انہوں نے اسے اپنے سینے میں سمیٹ لیا تھا اور ان کے سینے پر سر رکھے اس کے آنسو ان کے دل پر گرتے تھے۔

''آپ اچھے نہیں ہیں، آپ بالکل اچھے نہیں ہیں۔'' وہ بلک رہی تھی اور بڑی جرات سے بولتی تھی، اس کے نزدیک یہ دو جملے اس کی عظیم بدتمیزی تھے اور یہ بولتے ہوئے اسے احساس نہیں تھا کہ ان کا ری ایکشن کیا ہوگا، مگر اس پر کمبل درست کرتے ہوئے وہ بالکل خاموش تھے، انہوں نے کچھ بھی نہ کہا تھا، ڈانٹا تک نہ تھا، بس اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے اتنا ہی کہا تھا۔

''ہاں تم ٹھیک کہتی ہو، میں اچھا نہیں ہوں، بالکل اچھا نہیں ہوں۔'' آج پہلی بار ان کا لہجہ شکستہ تھا۔

☆.....☆.....☆

نا اُمیدی کی تاریکی میں

خوش اُمیدی کا سورج
مایوسیوں کی دھند میں
رحمتوں کا نزول
اور.....!!
افسردگی کی شام میں
خوشیوں کی ہوا.....!
کیا تم ان میں کسی سے ایک
خوشی کی سنہری کرنوں
کا تاج پہنے میری
زندگی کی راحت بن سکتے ہو؟؟؟

وہ بڑی دیر تک اپنی لکھی ہوئی سطریں دیکھتی رہی، پھر اس نے خاموشی سے ڈائری بند کر کے چھپا دی، اس بات پر بھی شکر تھا کہ اس نے جب ساری چیزیں چیک کیں تو سب ٹھکانے پر تھا، اس کی ڈائریز اور وہ حیدر کی تصویریں بھی، اسی طرح محفوظ تھیں اور جہاں وہ چھپاتی تھی وہیں ملے تھے۔

صبح کا آغاز ہو چکا تھا اور اسے لگتا تھا کہ پہلے کی طرح روٹین ہوگی مگر حیدر نے اسے منع کیا تھا کہ وہ باہر نہیں آئے گی اور نہ کسی کام میں حصہ لے گی، اسے اس حکم نے کچھ مزید ڈرا دیا تھا، پتہ نہیں اب مزید کیا باقی تھا، مگر وہ نہا کر بال خشک ہونے کے لیے چھوڑ کر کھڑکی کے آگے آن کھڑی ہوئی، ہلکے سے پردے سرکائے تو لان میں چمکدار دھوپ نکلی ہوئی تھی۔

اور لان کے بیچوں بیچ اس چھوٹے سے درخت کی ایک شاخ کو ہلاتے ہوئے وہ وہاں کھڑا ہنس رہا تھا، اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا، اس نے آگے بڑھ کر پھر دیکھا، پھر غور سے دیکھا اور پھر آنکھیں سکوڑ کر دیکھا اور پھر یکدم واپس پلٹی، اس کا رخ دروازے کی طرف تھا، وہ تیزی سے باہر کی طرف لپکی اور اس کوشش میں وہ یہ بھول گئی کہ اس کے پیروں میں جوتا تک نہیں تھا، وہ بس بھاگتی جا رہی تھی، ملازماؤں نے حیرانی سے اسے دیکھا

اور زمینوں سے واپس آتے ہوئے حیدر نے بھی ہی منظر دیکھا تھا۔

اور اب وہ اس درخت کے پاس کھڑی اکیلی ہنس رہی تھی، بے تحاشا ہنستی جاتی تھی، اس کے ساتھ ساتھ وہ کچھ بولتی بھی تھی اور پھر اس نے ایک شاخ کو پکڑ کر ہلانا شروع کر دیا۔

حیدر خاموشی سے کچھ فاصلے پر کھڑے اس کو دیکھ رہے تھے، پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھے اور جب دارین نے انہیں دیکھا تو وہ یکدم سے ڈر گئی، گھبرا گئی، اس نے شاخ کو ہلانا چھوڑ دیا اور بالکل سیدھی کھڑی ہو گئی، مگر اسے احساس ایکدم سے ہوا کہ اس نے جوتا نہیں پہنا ہوا تھا، نہ ہی اس نے بال باندھے ہوئے تھے، اس نے جلدی سے اپنی چادر سے کھلے بالوں کو ڈھکا تھا، مگر پیروں کا کیا کرتی؟

''اتنی سردی میں ادھر کیوں آ گئی دارین؟ جوتا بھی نہیں پہنا؟'' وہ نرمی سے سوال کر رہے تھے۔

وہ جواب دینے کی بجائے گھبراہٹ میں ہونٹ کچلنے لگی، انہوں نے سر جھک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے لے کر اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئے تھے، جس طرح اسے بھاگتے ہوئے دیکھ کر سب حیران رہ گئے اسی طرح ان دونوں کو ایک ساتھ اندر آتا دیکھ کر سب کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں تھیں، اپنے کمرے میں آ کر انہوں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''تم اپنی ضروری چیزیں پیک کر لو، آج شام ہم اسلام آباد جا رہے ہیں۔'' وہ کہہ رہے تھے اور دارین حیرت سے گنگ انہیں دیکھتی رہ گئی، اس ذہن ایک لفظ ''ہم'' پر اٹک کر رہ گیا تھا، وہ اپنی بات مکمل کر کے واپس کمرے سے جا چکے تھے۔

☆.....☆.....☆

یہ ایک لمبا سفر تھا اور وہ اس بات سے بخوبی آگاہ تھے، جبھی انہوں نے خود ڈرائیونگ کرنے کے بجائے ڈرائیو کو ساتھ لینا مناسب سمجھا تھا، سامان پیک کروا کر ڈکی میں رکھوا دیا گیا تھا اور وہ ان کے ساتھ پچھلی سیٹ پر تھی، سیاہ گرم سوٹ میں ساتھ کا دوپٹہ لیے اور اس سے اپنا چہرہ ڈھکے وہ یوں بیٹھی تھی جیسے نالائق طالب علم ہو، گاڑی میں مکمل خاموشی تھی۔

قریباً کوئی دو گھنٹے کے سفر کے بعد انہوں نے ایک جگہ گاڑی رکوائی تھی اور ڈرائیو کو چائے اور سینڈوچز لانے

کا آرڈر دیا تھا، وہ اسی طرح خاموش بیٹھی رہی، جبکہ اسے شدید پیاس لگی ہوئی تھی مگر اس نے ہمیشہ کی طرح لب بھینچے رکھے، وہ اپنے سیل پر مصروف تھے، مطلوبہ آرڈر آنے پر انہوں نے گاڑی میں بیٹھے ہی ٹرے وصول کی تھی اور سیٹوں کے درمیان دیکھا، وہاں سینڈوچز اور چائے کے دو کپ تھے، پھر اس نے نظریں اپنے پیروں پر جمادیں، وہ انہیں یہ باور نہیں کروانا چاہتی تھی کہ اسے بھوک لگی ہے، انہوں نے چائے کا کپ پکڑتے ہوئے اسے اشارہ کیا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔''

اس نے مدھم آواز میں کہا، وہ جو چائے کا پہلا گھونٹ لے رہے تھے ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگے، پھر ہاتھ آگے بڑھا کر کپ اس کے آگے کر دیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے چہرے سے چادر ہٹادی۔

''تھوڑا سا لے لو، سفر لمبا ہے اور اب تم میرے ساتھ ہو اس لیے۔ اس کی ضرورت نہیں۔''

ان کا اشارہ چادر چہرے سے ہٹانے کی طرف تھا، اس نے قدرے ہچکچا کر کپ پکڑ لیا تھا، چائے پیتے ہوئے وہ ایک ضروری فون کال اٹینڈ کرتے رہے مگر اس دوران بھی انہوں نے اسے سینڈوچ پکڑایا تھا، وہ چھوٹے چھوٹے نوالے لیتی ان کی انگریزی بڑے دھیان سے سن رہی تھی، یہ مختصر سا کھانا ختم کرنے تک ان کی کال بھی ختم ہو چکی تھی، پھر سے گاڑی چل پڑی۔

بہت دیر تک وہ اسی طرح خاموشی سے سفر کرتے رہے، پھر انہوں نے گاڑی کی لائٹ بجھانے کا آرڈر دیا تھا، اب شام ڈھل کر رات میں بدل چکی تھی، سردی بڑھ رہی تھی اگر گاڑی میں ہیٹر نہ ہوتا تو یقیناً اب تک وہ سردی سے لرز رہی ہوتی۔

''مجھے عادت ہے اتنے لمبے سفر کی، تمہیں نہیں ہے، کچھ دیر سو جاؤ۔'' انہوں نے نرمی سے کہا تھا، اس نے اندھیرے میں ان کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی تھی مگر ناکامی کے بعد آہستگی سے سیٹ سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ انہوں نے کچھ دیر اس کے سونے کا انتظار کیا، پھر ہیٹر بند کروا کر اسے گرم چادر اوڑھا کر اس کا سر اپنے کاندھے پر رکھ دیا تھا اور اس کے گرد بازو پھیلا کر بہت بے خیالی میں اس کا گال سہلاتے رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

معروف سائیکاٹرسٹ مسز رومانہ ندیم کے لیے یہ کیس بہت اہمیت کا حامل تھا، وہ اپنے سارے معاملات، ضروری اپائنٹمنٹس کینسل کر کے اس کیس کو لے کر بیٹھی تھیں، وگرنہ وہ اس قدر مہنگی اور مصروف سائیکاٹرسٹ تھیں کہ ان سے وقت لینے کے لیے لوگوں کو مہینوں انتظار کرنا پڑتا تھا، مگر مجبوری یہ تھی کہ اس کیس کے پیچھے جس آدمی کا نام تھا، وہ اتنا طاقتور تھا کہ وہ اس سے بگاڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتیں تھیں۔

حیدر چوہدری بیسویں اسکیل کا آفیسر ہی نہیں تھا بلکہ اس کا خاندانی بیک گراؤنڈ بھی بے حد مضبوط تھا، دوسری اہم خصوصیات اس کا کیپٹل میں پوسٹنگ ہونا تھا، سروس ریکارڈ بے حد شاندار تھا اور اگر یہ سب نہ بھی ہوتا تو یہ کیس لینے کے لیے ان کو ایک ہی بات کافی تھی کہ وہ ان کے شوہر کامران ندیم کا بیچ میٹ تھا اور کامران ہر صورت انہیں پریشرائز کرتے، جبھی وہ اس وقت اپنی اسٹڈی میں اپنے سامنے رکھی وہ تینوں ڈائریز جنہیں وہ پڑھی چکی تھیں حیدر چوہدری کا انتظار کر رہی تھیں۔

معاملہ خاصا الجھا ہوا تھا، انہوں نے کچھ ضروری نوٹس بنانے کے بعد اپنی رسٹ واچ پر نگاہ دوڑائی، ان کی آمد کا وقت ہوا چاہتا تھا، چند سیکنڈز بعد دروازہ کھلا اور دروازے میں ان کی صورت نظر آئی، وہ اپنی چیئر سے اٹھ کھڑی ہوئیں تھیں۔

''ہیلو سر! ہاؤ زیو؟'' وہ شائستگی سے مسکرا کر پوچھ رہی تھیں۔

''آئم فائن، واٹ اباؤٹ یو؟'' وہ بھی رسماً مسکرائے تھے۔

''آئم گڈ ٹو، گلیڈ ٹو ہیو یو ان مائے اسٹڈی، پلیز ٹیک یور سیٹ۔'' انہوں نے حیدر کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا، وہ ان کے سامنے بیٹھ گئے تھے۔

''شڈ وی سٹارٹ؟'' انہوں نے قدرے پروفیشنل انداز میں کہا، حیدر نے سر ہلا دیا، حیدر کو چند ضروری باتیں بتانے کے بعد دونوں ہاتھ بالوں میں پھنساتے ہوئے انہیں دیکھا۔ ''آئی وانٹ ٹو ہیو سم مور ڈیٹیلز، سو پلیز یو ڈونٹ مائنڈ فار مائے بینگ پرسنل۔'' وہ تھوڑا مزید پروفیشنل ہو گئی تھیں۔

''یا..... شیور۔'' ان کے چہرے پر مزید سنجیدگی آ گئی۔

''سب سے پہلے آپ کو کب فیل ہوا کہ دارین کوئی پرابلم فیس کر رہی ہے؟'' ان کا پہلا سوال سن کر وہ سوچ

میں پڑ گئے۔

''ٹوبی آنسٹ مجھے کبھی فیل ہی نہیں ہوا کہ اسے کوئی پرابلم ہے، مگر یہ ایک بہت عجیب دن کی بات ہے، میں نے دیکھا وہ کسی سے باتیں کر رہی ہے، بالکل جیسے سچ میں اس کے ساتھ کوئی بیٹھا ہو، وہ شاید خود کلامی کر رہی تھی، مجھے اسکی باتیں تو سمجھ نہ آسکیں مگر ان میں واضح طور پر ایک نام تھا، میں خاموشی سے پلٹ آیا، مجھے اس وقت کوئی اندازہ نہیں تھا کہ یہ کیا معاملہ تھا؟'' وہ خاموش ہو گئے۔

''پھر آپ نے اس معاملے کو انوسٹی گیٹ کیا؟'' وہ اگلا سوال کر رہی تھیں، وہ کچھ دیر خاموش رہے

''بالکل کیا، مجھے یہ جاننے میں پوری دلچسپی تھی کہ یہ کیا معاملہ تھا، اس نام کی انوسٹی گیشن کرتے وقت مجھے پتہ چلا کہ اس رات دارین ''دارا'' نامی جس شخص سے باتیں کر رہی تھی، وہ درحقیقت موجود ہی نہ تھا، میں نے دارین سے اس کی انوسٹی گیشن کرنے کی کوشش کی مگر اس نے بہت حیرانی سے انکار کر دیا، مجھے اس کے انکار پر طیش تو بہت آیا مگر میں ضبط کر گیا، اس سے پہلے حادثاتی طور پر میری والدہ کی وفات اور اس میں دارین کی انوالومنٹ سے معاملہ اس قدر کمپلیکس اور خوفناک تھا کہ مجھے اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ اس کا یہ ذہنی رخ اس کو کس طرف لے کر جا رہا تھا، پھر اتفاقاً اس کی ڈائریز مجھے ملیں، جن سے صحیح طور پر اندازہ ہوا کہ یہ مسئلہ اتنا آسان بھی نہ تھا، پھر مجھے لگا کہ مجھے کسی سے کنسلٹ کرنا چاہیے۔'' وہ تفصیل سے بتا رہے تھے۔

''آپ کے اور دارین کے درمیان کیا کبھی اچھے تعلقات نہیں رہے؟'' ان کا لہجہ کسی بھی قسم کے تاثر سے عاری تھا، مگر اس کے باوجود یہ حیدر چوہدری کے منہ پر ایک طمانچہ تھا، اپنے انتہائی ذاتی معاملے کو یوں زیر بحث لانا ان کے لیے ازحد تکلیف دہ تھا۔

''اٹس ٹرو۔'' انہوں نے مختصراً کہا۔

''آپ کی شادی کو قریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ ہو چکا ہے، مگر آپ اس کے ساتھ صرف سترہ دن رہے یعنی قریب قریب پانچ سو دس دنوں میں سترہ دن اور بس۔'' وہ مزید کہہ رہی تھیں۔

''ہوں۔'' ان کے دانت بھنچ رہے تھے، مگر وہ مجبور تھے۔

''آپ کا رویہ اس کے ساتھ بہت زیادہ تحکمانہ اور کمانڈنگ تھا۔'' وہ مزید بول رہی تھیں۔

''یس۔'' ان کا جواب پھر مختصر سا تھا۔

''چونکہ آپ زیادہ عرصہ تک اس کے ساتھ نہیں رہے اس لیے یقیناً آپ اس کے وہ معمول یا ڈیلی روٹین سے بھی بے خبر ہوں گے مگر میں جنریلی آپ سے کچھ سوال کروں گی، جیسا کہ۔''

''کیا وہ اکیلی سوتی تھی؟''

''جی ہاں۔''

''گھر کی مصروفیات میں اس کا کتنا حصہ تھا؟''

''بہت بڑا حصہ تھا، میری والدہ کی دیکھ بھال اور دیگر کام کاج وغیرہ۔''

''کوئی ذاتی دلچسپیاں؟''

''نہیں، میرے علم کے مطابق نہیں۔''

''کوئی دوستی کسی سے؟''

''آئی ڈونٹ نو۔''

''کیا وہ باتونی ہے؟''

''نہیں۔''

''کس حد تک خاموش طبع ہے؟''

''میری اس کے ساتھ کبھی کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔''

سوالات کا یہ سلسلہ جوں جوں آگے بڑھتا جا رہا تھا مزید پرسنل ہوتا جا رہا تھا اور حیدر چوہدری کا ضبط جواب دیتا جاتا تھا، مگر وہ مجبور تھے۔

☆.....☆.....☆

ڈھلتی سنہری شام میں موم کی مانند پگھلتی وہ لڑکی دارین چوہدری!!

جس کی کہانی عجیب تر ہے۔

جس کا ماضی حیران کن ہے۔

جس کا حال پریشان کن ہے۔

اور.....!

جس کا مستقبل تاریک؟؟؟

نفسیاتی طور پر ایک عجیب عارضے میں مبتلا تھی، اس کا شمار ان لوگوں میں تھا جو پیدائشی فطین کہلاتے ہیں۔ مگر قدرت کے بنائے گئے اس ذہین دماغ کو اپنی ذہانت و قابلیت دکھانے کا کوئی موقع نہ مل سکا، تنہائی، خوف اور سناٹا ان تینوں نے مل کر اس کا بچپن تاریک کر دیا اور اسی غبار نے جو اندر ہی اندر جمع ہوتا رہا، لاوا کی صورت نکالا تو وہ ''دارا'' کی شکل دھار گیا، دارین کا فرضی بھائی دارا، جو ہمیشہ اس کے ساتھ کھیلتا تھا، ہمیشہ کا ساتھ دیتا تھا اور جس سے اس کے سوا کوئی واقف نہ تھا، اس کا یہ خیالی بھائی ہر دکھ میں اس کی دلجوئی کرتا یہاں تک کہ جب اس کے باپ کی وفات ہوئی اس وقت بھی وہ اس کو دلاسہ دینے کے لیے موجود تھا اور پھر وہ ہمیشہ موجود رہا، اس کے ہر دکھ، ہر تکلیف میں اس کا ایک مضبوط سہارا بن کر۔

مگر ایک مشکل تھی وہ کسی کے سامنے نہیں آتا تھا، نہ ہی وہ اسے دوسروں کے سامنے لانا چاہتی تھی، اسے ڈر لگتا تھا، وہ بھی اگر دوسروں کی طرح اس سے بے پرواہ ہو گیا تب وہ کیا کرے گی؟

اسی خوف کے پیش نظر اس نے سب سے چھپا کر ''دارا اور دارین'' کی ایک الگ دنیا بسالی، ایسی دنیا جس سے سب لاعلم تھے اور کسی کو نہیں پتہ تھا کہ دارین چوہدری ایک دوغلی زندگی جیتی تھی۔

آٹھ سال کی اس لڑکی نے جب پہلی مرتبہ ''دارا'' کو اپنی زندگی میں شامل کیا تو وہ بارہ سال کا تھا اور اب جبکہ وہ ساڑھے انیس سال کو ہو چکی تھی وہ پھر بھی بارہ سال کا ہی تھا، وہ اسے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتی تھی اور اس کی ذات کے وہ تمام کمزور و تاریک پہلو جن سے اس کا بھائی دارا ہی آگاہ تھا، کوئی نہیں جانتا تھا کہ اسے تنہائی سے خوف آتا تھا، اسے ہجوم میں رہنا اچھا لگتا تھا، اسے خاموشی سے نفرت تھی، وہ چپ بیٹھ ہی نہ سکتی تھی، اسے ہنسنا، قہقہے لگانا پسند تھا، اسے مسکراتے لوگ پسند تھے، اسے خاموش طبع اور سنجیدہ لوگوں سے عجیب سی چڑ تھی، اسے روشنیاں، اجالے، ہنسی اور پھول پسند تھے، اسے اندھیرے سے ڈر لگتا تھا، وہ اندھیرے میں نہیں جا سکتی تھی۔

اور اس کی ان سب باتوں سے بس دارا آگاہ تھا، صرف وہی جانتا تھا کہ اسے کس چیز سے دکھ ہوتا تھا، اسے

کیا چیز بری لگتی تھی، اسے کیا پسند تھا اور ناپسند؟ یہاں بس دارا ہی تو اس کا اکلوتا رازدان تھا۔ مگر ''شیش محل'' میں اس کے حصے جو زندگی آئی وہ اس زندگی سے قطعاً مختلف تھی جس کے خواب اس نے دیکھے۔

حیدر کو اندھیرے پسند تھے اور وہی اندھیرے اس کی قسمت میں لکھ دیئے گئے، حیدر کو سنجیدگی بھاتی تھی، اس کی مسکراہٹ خوف سے سکڑ گئی۔

حیدر کو شوخی و شرارت سے چڑ تھی، اس نے خود کو سنجیدگی کے خول میں قید کر لیا، حیدر کو غیر ذمہ داری و لاپرواہی سے نفرت تھی اس نے خود کو ذمہ دار کہلانے کے چکر میں نڈھال کر لیا اور اس کے ان تمام دردوں اور اذیتوں سے بس اک وہی تو واقف تھا۔

☆.....☆.....☆

انسانی دماغ بہت عجیب چیز ہے بچپن کے خوف اور ڈر اس کے اندر یوں بیٹھ جاتے ہیں جیسے پانی کی تہہ میں پتھر۔ دارین چوہدری کا دماغ ایک ایسا قابل دماغ تھا، جو گزری کسی بات کو بھلانے کی بجائے ایک لائبریری کی مانند ہر بات ہر واقعہ ہر لہجہ ایک کتاب کی صورت محفوظ کرتا جاتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس نے حیدر چوہدری کی کہی ہر بات کو ذہن میں محفوظ کر لیا اور پھر اسے اپنی ڈائریز پر ٹرانسلیٹ کر دیا۔

بعض دفعہ انسان جب کسی کے آگے دل کی بھڑاس نہیں نکال پاتا تو یہ جمع شدہ غبار ایک لاوے کی صورت جمع ہوتا جاتا ہے اور جب پھٹتا ہے تو شاید کسی دارا کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

نفسیات اگرچہ ایک وسیع و عریض پیمانے پر پھیلا ہوا مضمون ہے مگر نفسیات بھی اس بات کا تعین کرنے میں ناکام ہے کہ انسان کی نفسیاتی بیماری اور ماحول کا اثر زیادہ ہوتا ہے یا وارثت کا۔

مگر ایک بات بڑے یقین سے کہی جا سکتی ہے، انسانی ذہن کا کسی بھی عارضے میں مبتلا ہونا کوئی دو دن کا واقعہ نہیں بلکہ یہ کئی سالوں کی کارفرمائی ہے اور اکثر تو نفسیاتی عارضوں کو سنجیدگی سے لیا ہی نہیں جاتا، بہت سے لوگ مرتے دم تک اپنی اذیت و کرب سے نجات پانے میں ناکام رہتے ہیں، اس کی ایک چھوٹی سی مثال خود کلامی ہے، ہمارے ہاں خود کلامی کو بالکل اہمیت نہیں دی جاتی، اس کی وجہ سے ہی ایک ''دارا'' تخلیق پا گیا، ڈاکٹر رومانہ ندیم نے ایک نظر حیدر کی طرف دیکھا اور پھر بولیں۔

''ہوسکتا ہے دارین چوہدری کے آباواجداد میں سے کوئی اس مرض کا شکار رہا ہو اور اسی بنا پر یہ وارثتی طور پر اس میں منتقل ہوگیا۔ مجھے اس کے لیے مکمل طور پر انوسٹی گیٹ کرنا پڑے گا، آپ کا تعاون، دارین کی والدہ کا تعاون درکار ہوگا۔''

''مجھے قریباً ایک ماہ چاہیے Symptoms کو چیک کرنے کے لیے، کچھ ٹیسٹ ہوں گے، MIR اور سکین CT بھی ہوسکتا ہے مگر یہ ابھی امکانی بات ہے، ہوسکتا ہے اس کی ضرورت ہی نہ پیش آئے۔''

''اس کے رویے، عادات اور خیالات کی جج منٹ ہوگی، اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کیا جاسکے گا۔''

''مگر کچھ باتیں جو میں اس قسم کی تشخیص کے بغیر بھی آپ کو واضح کرسکتی ہوں، وہ یہ ہیں کہ۔''

''شیزوفرینیا۔'' کی ہی ایک قسم میں یہ بیماری کے سرے ملتے ہیں جس میں انسان کو بچپن کا کوئی سخت حادثہ، ماں یا باپ کی علیحدگی، جنسی زیادتی اور وراثتی طور پر یہ بیماری انجیکٹ ہوکر آگے بڑھتی ہے، ایسے لوگوں کو دیکھنا جو درحقیقت موجود نہ ہوں یہ بھی الوژنز Hallusinations میں آتا ہے جو کہ شیزوفرینیا کی پیرانائڈ فارم ہے، وارثتی طور پر دس فیصد امکانات ہوتے ہیں کہ یہ عارضہ آنے والی اولاد میں منتقل ہوسکتا ہے، ہر سو میں سے ایک فرد اس کا شکار ہوسکتا ہے، اس کی دیگر وجوہات میں سائنسی لحاظ سے بہت کچھ آجاتا ہے جیسا کہ ڈیورنگ ڈلیوری پرابلمز وغیرہ۔''

''مگر یہاں ہم اس بات کی تفصیل میں اس لیے بھی نہیں جاسکتے کیونکہ ابھی وقت سے پہلے بغیر تشخیص کے ہم دارین کو اس بیماری کا مریض نہیں قرار دے سکتے، اب تک جتنا میرے علم میں آیا ہے اس کے مطابق یہ کوئی معمول کا پرسنالٹی ڈس آرڈر ہوسکتا ہے اور سب سے بڑھ کر اس چیز کا یقین رکھیں کہ یہ جو بھی ہے ہم اس کا علاج کرسکتے ہیں، یہ ممکن ہو چکا ہے، اس کا پراپر ٹریٹمنٹ ہوگا اور آپ سب لوگوں کی مدد چاہیے ہوگی بس۔'' سب کچھ تفصیل سے بتا کر ڈاکٹر رومانہ ندیم خاموش ہوچکی تھیں اور اب خاموش ہونے کی باری ان کی تھی۔

☆.....☆.....☆

ایک مکمل طبی تشخیص، اس کو جانچا، پرکھا گیا، اس کے بلڈ ٹیسٹ ہوئے اس کی سی ٹی اسکین لیا گیا، اس کی بچپن کی عادات و واقعات کی انوسٹی گیشن کی گئی اور اس کے بعد اس کی ریلشن شپ پرابلمز کا جائزہ لیا گیا تھا اور پھر

تصدیق کردی گئی، مسز رومانہ ندیم نے انہیں بریفنگ دیتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ شیزوفرینیسک کیس نہیں ہے، اگر ایسا ہوتو تو دارین کبھی بھی زندگی کے باقی معاملات میں نارمل نہ ہوتی، وہ ایک حساس، ہوشمند اور ذی شعور لڑکی ہے، شیزوفرینیسک پیشنٹ کبھی کبھی اتنے ریگولر نہیں ہوتے، عام طور پر وہ کسی کام کو مستقل طور پر نہیں کرتے، نہ ہی وہ کسی سے آنکھ ملا کر بات کرتے ہیں، بہت خاموش طبع ہوتے ہیں یا بہت شکی، بہرحال ان میں سے کوئی بھی Symptoms اس میں نہیں پایا گیا۔''

''دارا اس کی بچپن کی تنہائی اور محرومی کا رزلٹ ہے، یہ اسکی خود کلامی کی ایک بگڑی شکل ہے، ایک سیدھا سادا پرسنالٹی ڈس آرڈر، اس کے لیے کچھ میڈیشن، کونسلنگ اور کچھ ٹریٹمنٹ کرنا ہوگا جو قریباً چھ ماہ تک جاری رہ سکتا ہے، اسے شدید کیئر اور اٹینشن کی ضرورت ہے، اسے سوشلائز کریں، اس کے ذہین اور قابل دماغ کو کسی کنسٹرکٹو اور پازیٹو وے میں استعمال کریں اور یاد رکھیں، کہیں نہ کہیں اسے ایک ''ہمدرد'' کی ضرورت ہے اور کہیں نہ کہیں وہ خود بھی اس بات سے آگاہ ہے کہ دارا کا کوئی وجود نہیں بس آپ اسے حقیقت اور وہم میں فرق سمجھائیں اور نرمی و توجہ سے اسے سنبھالیں کیونکہ زور سے کھینچے سے دھاگا ٹوٹ بھی جاتا ہے۔'' ایک بار پھر وہ بول رہی تھیں اور حیدر خاموش تھے۔

☆.....☆.....☆

یہ اسلام آباد کی ایک چمکدار اور نکھری صبح کا منظر تھا، رات وہ دونوں اس لمبے سفر سے از حد تھک کر سوئے تھے اور اب صبح جبکہ وہ ابھی بھی سو رہی تھی انہوں نے اس کا چہرہ دیکھا، پھر پیار سے اس کا گال تھپتھپایا۔

''دارین!'' انہوں نے پھر سے اسے آواز دی اور اسی پل اس کی نیند سے بھری آنکھیں کھل گئیں، پھر وہ کہنی کے بل اٹھ گئی، انہوں نے دیکھا اب وہ اپنی چادر لپیٹ رہی تھی، انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔

''آؤ! تمہیں کچھ دکھانا ہے۔'' وہ اسے ساتھ لے کر تیزی سے باہر نکل گئے، سیڑھیاں چڑھ کر وہ اسے اس کوٹھی کی چھت پر لے آئے، پھر عقبی حصے والی دیوار کے پاس آ کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

اس نے منڈیر پر ہاتھ رکھتے ہوئے نیچے جھانکا اور سامنے وہ منظر تھا جس نے چند لمحوں کے لیے اس کی

آنکھوں میں چاندی اتار دی تھی، دور اسلام آباد کی پہاڑیوں پر پھیلی دھند اور ان کے عقب سے طلوع ہوتا اک نیا سورج جس کی سنہری کرنیں اپنی نوخیز روشنی سے دھند کو مزید دھندلا رہی تھیں اور اس روشنی کی کرنیں فیصل مسجد کے سنہرے چاندوں پر چمک رہی تھیں اور اس کے آگے پھسلتی ہوئی نظر جب اس گھر کے وسیع لان میں پڑتی تھی تو وہاں کچھ اور بھی تھا جو آنکھوں کو خیرہ کرتا تھا، گہری سبز گھاس میں جہاں گل لالہ اور گلاب کی گہری باڑیں تھیں اور ان رنگ رنگ پھولوں پر اوس کے قطرے ٹھہرے ہوئے تھے، اس ہریا دل کے عین وسط میں دو مور اپنے پنکھ پھیلائے کھڑے تھے، سورج کی چمکیلی شعاعیں جب ان کے پروں پر پڑتی تھیں تو ان کے دلکش پروں سے قسم ہا قسم کے رنگ پھوٹتے تھے، وہ مسحور کن سی اس حسین منظر میں گم تھی، جب کبوتروں کا ایک غول ایک سمت سے اڑتا ہوا آیا ان کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سے ماحول میں ہلکا سا ارتعاش پھیلا تھا جس نے اسے قدرے چونکایا، آہستگی سے پیچھے مڑتے ہوئے اس نے انہیں دیکھا، جو منتظر نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہے تھے، جیسے اس کا ردعمل جاننا چاہتے ہوں۔

''یہ..... بہت خوبصورت ہے۔'' وہ ستائشی انداز میں کہہ رہی تھی، انداز میں ہلکی سی جھجک تھی۔

''اسی لیے تو میں تمہیں یہاں لے کر آیا تھا۔'' ان کی آواز پر اس نے چونک کر انہیں دیکھا اور لمحہ بھر میں ہی ماحول کا یہ فسوں بھک سے اڑ گیا تھا، وہ بے یقینی سے انہیں دیکھتی ہوئی پیچھے ہٹی۔

''کس لیے؟ کس لیے لے کر آئے ہیں آپ مجھے؟ بدلہ پورا نہیں ہوا نا ابھی؟ ماں کا انتقام لینا چاہتے ہیں، مجھے اس جگہ اس لیے لے کر آئے ہیں کہ مجھے مار ڈالیں، یہاں سے دھکا دے کر گرا دینا چاہتے ہیں مجھے، اس طریقے سے مارنا چاہتے ہیں مجھے۔'' وہ بے حد خوفزدہ ہوتی قدم بہ قدم پیچھے ہٹتی بول رہی تھی، اس کی نظریں مسلسل حیدر پر تھیں، جیسے وہ اس کے لیے خطرہ تھے۔

انہوں نے بے حد تھک کر اور افسوس سے اسے دیکھا اور پھر رخ موڑ کر واپس سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔

ان کے پاس اسے یہ یقین دلانے کا (کہ وہ اسے نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے) اور کوئی ذریعہ نہ تھا کہ وہ واپس چلے جاتے، اس لیے وہ واپس مڑ گئے۔

☆.....☆.....☆

''شک اور بے یقینی کی گرد ہر رشتے کی خوبصورتی دھندلا دیتی ہے۔''

اس کا شک اور بے یقینی دونوں ہی بجا تھے، بھلا حیدر چوہدری کا اتنا الٹ اور متضاد رویہ وہ برداشت کر سکتی تھی، پتہ نہیں ان کو کیا ہو گیا تھا، خود ہی اسے اپنی لائبریری میں لے گئے اور وہ ان کی اتنی بڑی اور اتنی پیاری سجاوٹ والی لائبریری دیکھ کر ہکا بکا ہی تو رہ گئی تھی، انہوں نے اسے بڑی فراخ دلی سے اجازت دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ کوئی بھی کتاب پڑھ سکتی ہے تو چند لمحے وہ ساکت سی اپنی سماعتوں پہ شک کرتی بے یقینی سے انہیں دیکھتی رہ گئی تھی، پھر جب ان کے چہرے پر حوصلہ افزاء مسکراہٹ دیکھی تو اسے یقین کرنا پڑا تھا کہ وہ حیدر ہی تھے۔

وہ ٹوٹی بکھری ہوئی تھی، یہ کتابیں اس کی ساتھی بن گئیں، ان کتابوں نے اسے سہارا دیا تھا، وہ سارا دن کتابیں پڑھتی اور پھر ان کو سوچتی رہتی، ایسے ہی ایک دن وہ مختار مسعود کی سفر نصیب کو پڑھتے پڑھتے ٹھٹک گئی، اس میں ایک کردار ڈاکٹر ایل کے حیدر کا تھا، وہ بہت دیر تک حیدر کے لفظ پر انگلی پھیرتی رہی اور جب اس نے نظر اٹھائی تو وہ اس کے سامنے تھے، وہ قدرے گھبرا کر کتاب بند کرنے لگی جب انہوں نے اس کے ہاتھ سے کتاب لے لی۔

''کیا پڑھ رہی تھیں؟'' وہ کتاب کے ورق الٹتے ہوئے پوچھ رہے تھے، وہ خاموش رہی، کچھ لمحوں بعد انہوں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ جلدی جلدی اپنی ڈائری میں سے قلم نکال کر اسے بند کر رہی تھی، اس کے چہرے پر ہلکی سی تمتماہٹ تھی اور وہ ان سے نظریں نہیں ملا رہی تھی، وہ جیسے ایک لمحے میں وہاں سے غائب ہو جانا چاہتی تھی، وہ ہر صورت اپنے راز اپنی ڈائری کو چھپانا چاہتی تھی، مگر انہوں نے خود ہی اس کی مشکل آسان کر دی۔

وہ کتاب کو اسی میز پر رکھ کر وہاں سے اٹھ گئے، وہ پلکیں جھپکتے ہوئے ان کی پشت کو دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

سنہری صبح کا آغاز تھا، اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں اور پھر آواز نکالے بغیر بستر سے اتر آئی، اس کا رخ واش روم کی طرف تھا، اس نے منہ دھویا اور پھر اسی خاموشی سے کمرے سے نکل گئی، اب اس کا رخ چھت کی طرف تھا، بے آواز سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے چھت کا دروازہ کھول دیا، ایک روشن اور کھلا ہوا دن اس کے سامنے تھا خوبصورتی تھی، روشنی تھی مور تھے اور دارا تھا، وہ کھلکھلا کر اسے ساری باتیں بتا رہی تھی اور وہ

بے یقین تھا۔

''یقین نہیں ہوتا، وہ اتنا کیسے بدل گئے ہیں؟'' وہ حیرانی سے پوچھ رہا تھا۔

''عیشاں کی وجہ سے۔'' وہ کچھ سوچ کر بولی تھی۔

''کیا مطلب؟''

''ہاں ناں، عیشاں نے انہیں سب سچ بتا دیا تھا نا، پنچائیت کے سامنے۔'' وہ فخر سے بولی۔

''اچھا تو اب وہ تمہیں ڈانٹتے تو نہیں؟'' وہ فکر مند تھا۔

''اب تو وہ مجھے کچھ بھی نہیں کہتے۔'' وہ سابقہ فخریہ انداز میں بولی تھی۔

''پتہ ہے ادھر کتنے ہی ملازم ہیں، میں تو کوئی کام نہیں کرتی، سب کچھ وہی کرتے ہیں۔''

''اچھا؟ کھانا بھی ملازم بناتے ہیں؟''

''ہاں۔''

''تم کھاتی ہو؟''

''نہیں۔'' وہ یکدم اداس ہو گئی۔

''کیوں؟''

''دل نہیں چاہتا۔''

''کتابیں پڑھتی ہو؟''

''ہاں ناں..... بہت۔''

''اب تو رات کو ڈر نہیں لگتا؟''

''لگتا ہے۔''

''کیوں، حیدر پاس نہیں ہوتے ہیں؟''

''ان سے ہی تو ڈر لگتا ہے۔'' اس کے چہرے پر زردی اور آنکھوں میں خوف پھیلا تھا۔

''کیوں؟''

''ہر بات کا جواب نہیں ہوتا۔'' اس نے نظر چرا کر لان میں جھانکا، جہاں مور اپنے پر پھیلا رہے تھے۔

''پتہ ہے میرا کبھی کبھی دل کرتا ہے میں اس کے مور کے پنکھ کا ایک رنگدار حصہ توڑ لوں؟''

وہ اسے اپنی عجیب و غریب سی خواہش بتا رہی تھی۔

''تو توڑ لو۔''

''ڈر لگتا ہے نا۔''

''کس بات کا ڈر؟''

''ان کا۔''

''کیوں۔''

''وہ بہت سخت ڈانٹیں گے۔''

''اس میں ڈانٹنے والی تو کوئی بات نہیں۔''

''پتہ نہیں، مجھے تو ایسے ہی لگتا ہے۔''

''میں توڑ دوں؟''

''وہ کیسے؟''

''نیچے جا کر اور کیسے؟''

''اوہ نہیں، کبھی نہیں۔''

''کیوں؟ تمہیں اعتراض ہے؟''

''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں، انہیں ضرور ہوگا۔''

''تمہیں ان کی اتنی پرواہ کیوں ہے؟''

''بات پرواہ کی نہیں، میں وہ کام نہیں کرنا چاہتی جس سے وہ مجھے لاپرواہ اور غیر ذمہ دار سمجھیں''۔

''اوہ یعنی تم ان سے ڈرتی ہو؟''

''بہت۔''

''کیوں؟''

''پتہ نہیں۔''

کچھ دیر خاموش رہی۔

''تو پھر..... میں تمہیں وہ رنگدار پنکھ لادوں نا؟''

''بالکل نہیں، انہوں نے میری جان نکال دینی ہے۔'' اس نے آنکھیں قدرے پھیلا کر اسے دیکھا۔

''مگر تم تو کہہ رہی تھی وہ بہت بدل گئے ہیں۔''

''انسان کی فطرت تو نہیں نا بدلتی۔'' اس کی نظریں اب پھر مور پر تھیں۔

''کس سے باتیں کر رہی ہو دارین؟'' حیدر کی مدھم آواز پر اس کے پیروں سے زمین کھسک گئی، وہ ایک جھٹکے سے مڑی، وہ اس کے سامنے تھے، اسے تمام تر رعب اور شہنشاہی جلال کے ساتھ اپنی چمکدار آنکھوں کو اس پر مرکوز کیے وہ ایک سوال لیے اس کے منتظر تھے، اس نے خوفزدہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

''میں نے پوچھا ہے تم کس سے باتیں کر رہی ہو؟'' وہ ایک قدم اس کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھ رہے تھے، اس نے دیوار کے ساتھ لگتے ہوئے دائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''دارا سے۔'' اس نے بمشکل جواب دیا۔

''There is no D'ara''۔ انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا، دارین کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا، اس نے بے یقینی سے دائیں طرف دیکھا، وہاں اب کوئی بھی نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

رات سرد اور تاریک تھی، ایک مخصوص خاموشی اور دھند ہر سو چھائی ہوئی تھی، وہ بہت دیر سے سونے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کا ذہن اتنے ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا کہ وہ چاہنے کے باوجود سو نہیں پا رہی تھی، سینے تک کمبل اوڑھے سیدھی بیڈ پر لیٹی وہ ان کے ڈر سے کروٹ تک نہیں لے رہی تھی، کیونکہ وہ جاگ رہے تھے، ہمیشہ کی طرح سیل فون ان کے ہاتھ میں تھا، کچھ دیر بعد انہوں نے موبائل ایک طرف رکھ دیا اور اس کی طرف دیکھا۔

''کیا بات ہے دارین؟ نیند نہیں آ رہی؟'' انہوں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا، پتا نہیں کیوں اس کا دل

بھر آیا ''پتا نہیں، نیند نہیں آ رہی۔'' اس کی آواز بھر آ گئی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' انہوں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

''کچھ نہیں؟'' وہ آنسو ضبط کر رہی تھی، انہوں نے اس کے گال پر ہاتھ پھیرا تھا۔

''کیا بات تنگ کر رہی ہے بتاؤ مجھے۔'' انہوں نے اسے قریب کر لیا، وہ ہار گئی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''میں اچھی لڑکی نہیں ہوں، میں بہت بری ہوں، اسی لیے میرے ساتھ ایسا ہوا، پہلے میرے بابا چلے گئے، پھر امی نے بھی کوئی پیار نہ دیا، میں اکیلی رہتی تھی، پھر دارا آ گیا، وہ میرا دوست تھا، میرا بھائی تھا، وہ مجھے بہت پیار کرتا تھا، میرا خیال رکھتا تھا، پھر آپ آ گئے، آپ نے پتا نہیں کیوں ہمیشہ مجھے نظر انداز کیا۔ آپ نے مجھے دکھ دیے۔ اور اذیت، میں کرب سے روتی رہی کسی کو میرا خیال نہ آیا، کسی نے بھی میری مدد نہ کی، مجھے ماں کا خیال رکھنے پر لگا دیا اور پھر ان کی موت کا الزام بھی میرے سر آ گیا، اگر عیشاں واپس نہ آتی تو آپ مجھے اسی قید میں رکھتے۔ کبھی میری صورت نہ دیکھتے کبھی میری بات پر یقین نہ کرتے اور آپ نے کیا بھی نہیں۔ ہمیشہ مجھے برا سمجھا، مجھے غیر ذمہ دار اور لاپرواہ خیال کیا، مجھے قاتل قرار مجھے نظر انداز کیا۔ آپ نے مجھے دکھ دیے کر مجھ پر ہاتھ اٹھایا، مجھ پر کھانا بند کر دیا، مجھے وہاں ڈر لگتا تھا، میں ہر وقت روتی تھی، وہاں تو صاف پانی تک نہ تھا، دن میں ایک وقت کا کھانا ملتا تھا اور میں اپنے گناہوں کی معافی مانگ مانگ کر تھک گئی، پھر مجھے ایک دن بتایا گیا کہ میں تو بے گناہ ہوں، وہ الزام تو غلطی سے لگایا گیا تھا، پھر آپ مجھے لے آئے دوبارہ سے، میری غلطی کہاں ہے بس مجھے یہی نہیں پتہ چل رہا، میں کیوں اتنی سزا جھیلتی رہی؟ میرے گناہ کیا ہیں؟ مجھے کوئی تسلی دینے والا تھا، تو وہ صرف دارا تھا اور اب آپ کہتے ہیں دارا کہیں نہیں ہے آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں، صرف دارا ہی تو مجھ سے پیار کرتا ہے، وہ کیوں نہ ہو؟ اسے تو کبھی نہیں جانے دینا میں نے، اس کو تو ہمیشہ رہنا چاہیے، دار کا وجود کیوں نہیں؟'' وہ ان کے سینے سے لگی روتی جا رہی تھی، اس کی باتیں بے ربط تھیں، ٹوٹ پھوٹ کا شکار، وہ خاموشی سے اسے تھپک رہے تھے، یہ کتھارسس کا پہلا مرحلہ تھا، ابھی تو بہت کچھ باقی تھا، بہت کچھ کہا اور سنا جانا تھا۔

☆.....☆.....☆

بڑی عجیب بات تھی، انہوں نے آفس سے چھٹی لی ہوئی تھی، وہ سارا وقت اس کے ساتھ گھر ہی رہتے تھے، ہر جگہ اس کے ساتھ، اکٹھے کچن میں جاتے، وہ ان کے لیے کھانا بناتی تو وہ بیٹھے اسے دیکھتے رہتے تھے، پھر اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے تھے، اس کے بچپن کی باتیں پوچھتے تھے، وہ رک رک کر ان کو جواب دینے کی کوشش کرتی تھی پھر سوچتی تھی پتا نہیں کس بات پر وہ برا مان جائیں، ناراض ہو جائیں، اس لیے وہ بہت سوچ سمجھ کر جواب دیتی تھی۔

وہ اس کے ساتھ لان میں بیٹھتے، جہاں خوشبو تھی، تازہ اور کھلی ہوا تھی اور مور تھے، وہ اس کے ہاتھ کی بنی چائے پیتے تھے اور کوئی بک لے کر اس سے ڈسکس کرتے تھے اور صبح طلوع آفتاب کا منظر اسے چمکتے دن کے ساتھ دیکھنے کو ملتا تھا اور پھر اپنے سیاہ پر پھیلائے رات آتی تو اس میں سکون ہوتا تھا، وہ ان کے سینے پر سر رکھے ان کی دھڑکن اور سانسوں کی مدھم لے کو سنتی تھی اور اس کے مہکے ہوئے حصار میں کب اس کی آنکھیں بند ہوتیں اسے پتا ہی نہ چلتا تھا۔

اور پھر وہ اسے ایک دن مارکیٹ لے گئے، وہ حیرانی سے مر جانے کو تھی، جب اسے انہوں نے اپنی پسند سے بہت سے خوبصورت لباس اور جوتے لے کر دیئے، وہ جیسے کسی خواب کے سفر میں تھی اور پھر خواب بھی ایسا جس سے آنکھیں کھولنا مر جانے سے زیادہ اذیت ناک تھا، وہ ہر صبح جاگنے کے بعد بھی بہت دیر تک انہیں دیکھتی رہتی تھی اور بہت دنوں سے دارا بھی اس سے خفا تھا، وہ بھی ملنے نہیں آتا تھا۔

☆.....☆.....☆

''اتنی مہربانیاں اور ایسی نظر کرم، وجہ سمجھ نہیں آتی، نجانے کیوں یہ سب ایک سازش لگ رہا ہے، بھلا ماں کے جانے کے بعد وہ جو میری شکل دیکھنے کے روادار نہ تھے، اب ایک دم سے ایسا کیا جادو ہوا، مجھے سمجھ نہیں آتی، انہیں اب کیا ہو گیا ہے؟ کیا کریں گے اب وہ؟ کیا انہیں ماں کی موت بھول گئی ہے، انہیں تو ماں کے بغیر سانس نہیں آتا تھا اور جب شبینہ باجی نے مجھ پر جھوٹا الزام لگایا تھا تب بھی ان کا وہ غضب اور قہر کیسے بھول سکتی ہوں میں، اب مجھے یہاں لے آئے ہیں، اس کے پیچھے یقیناً کوئی نہ کوئی سازش چھپی ہے میں کبھی مان ہی نہیں سکتی کہ انہیں مجھ پر رحم آ گیا ہو، بھلا جو رحم ڈیڑھ سال میں نہیں آیا یہ کچھ دنوں میں کہاں سے پھوٹ پڑا، میری تنہائی اور اکیلے پن کا

خیال ان کو کیسے آ سکتا ہے، جنہوں نے بس کل ملا کر مجھے سترہ دنوں سے نوازا تھا بلکہ دن کہنا بھی ان کی توہین ہوگی رات کہنا مناسب ہوگا۔'' اس کا قلم رواں تھا۔

''ویسے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ یہاں آ کر مجھے اس عذاب سے تو نجات مل گئی ہے جو شیش محل میں ان کی قربت کی صورت سہنا پڑتا تھا، مگر یہاں تنہائی کا عذاب ہے، کوٹھی میں سارے مرد ملازم ہیں جن سے مجھے بات کرنے کی اجازت نہیں، ویسے اجازت ہو بھی تو میں نے کیا کرنا مجھے ویسے ہی ہر چیز بری لگتی، ایسی تنہائی سے تو شیش محل اچھا تھا، شاید اسی لیے یہاں لے آئے کہ سب کی صورت دیکھنے کو ترسایا تھا ادھر سب کی صورت کو ترسا مارا، ہونہہ ہوگا یہ بھی گھائل کرنے کا انداز، پتا نہیں انہیں کیا ملتا؟ شاید میری شکل سے ہی نفرت کرتے جو مجھے اتنی سخت سزائیں دیتے ہیں، اذیت دینے کا یہ عالم ہے کہ ہر وقت ساتھ ساتھ رہتے ہیں، اتنی نگرانی کرتے ہیں جیسے میں ان کے خزانے چرا کر بھاگ جاؤں گی، حد ہوگئی ہے یہاں تک کے کھانا بناتے وقت بھی ساتھ رہتے ہیں، میں کون سا ان کے کھانے میں زہر ملا دوں گی، شاید شک کرتے ہیں اور جب کھانا بنا کر سامنے رکھوں تو مجھے پہلے کھانے کا کہہ دیتے ہیں، ہاں ناں، جیسے زہر ہو بھی تو پہلے میں مروں، افسوس، سنگدل انسان، یہ تو سوچیں کہ میں نے تو شیش محل کی قید میں رہ کر کچھ نہیں کیا، اب کہاں سے کروں گی اور رات کو ساتھ لپٹا کر سوتے ہیں جیسے میں بھاگ جاؤں گی، بھاگ کے جاؤں بھی تو کہاں، اس شہر میں بھلا میرا کون ہے اور اس شہر کی کیا بات، میرا کہیں بھی کوئی نہیں، جاؤں تو کہاں جاؤں گی؟''

''اور باقی رہ گئی کتابوں کی بات، ہونہہ..... سب افسانوی باتیں، سب جھوٹ، میں کیا کروں ان کتابوں کا، یہ میری زندگی نہیں بدل سکتیں، اب تو انہیں پڑھ کے بھی اندر کوئی خوش فہمی نہیں جاگتی، کوئی امید نہیں پیدا ہوتی اور وہ..... وہ مجھ سے یوں کتابوں کے بارے میں رائے مانگتے ہیں جیسے میں کوئی عالمہ فاضلہ ہوں، ہونہہ ظالم انسان، میری سوچوں کو سلاخوں میں قید کر کے نجانے کون سی نظریاتی وسعت چاہتے ہیں، سمجھ نہیں آتا مجھے دکھ ہوتا ہے اور پتا نہیں کیوں ہوتا ہے، دل چاہتا پتھر بن جاؤں۔''

بس اب کچھ دیر میں محسن

وہ پتھر ٹوٹ جائے گا

میں اس کی سرد مہری پر
محبت مار آیا ہوں!!!

☆.....☆.....☆

''دارین!'' انہوں نے اسے آواز دی۔ وہ جو بڑی دیر سے آئینہ کے آگے کھڑی بال سنوار رہی تھی اس نے پلٹ کر انہیں دیکھا اور اس کی آنکھیں چندھیا سی گئیں، سیاہ شلوار قمیض میں وہ سنہری شہزادہ اس کے ساتھ کھڑا تھا، ان کی ہائیٹ اس سے کافی لمبی تھی جبھی تو بمشکل ان کے سینے تک آ رہی تھی، اس نے آہستگی سے واپس پلٹتے ہوئے ہیر برش واپس رکھا اور ان کی طرف مڑی، سبز رنگ کے فراک میں بال کھولے اس کا چہرہ بڑا روشن اور اس کی صحت پہلے سے کافی بہتر نظر آتی تھی، وہ چند لمحے اسے دیکھتے رہے، پھر اس کے بالوں کو چھوتے ہوئے مدھم انداز میں انہوں نے کہا تھا۔

''خوبصورت لگ رہی ہو۔'' دارین کی دھڑکن جیسے تھم سی گئی۔

آج وہ اسے ڈاکٹر رومانہ ندیم کے پاس لے کر جا رہے تھے اور اس لیے انہوں نے اسے تیار ہونے کا کہا تھا، اس نے بال سمیٹ کر کیچر لگایا اور آہستگی سے ان کے ساتھ آگے والی سیٹ پر تھی، گاڑی میں مکمل خاموشی تھی اور وہ سامنے ونڈ اسکرین سے گزرتے مناظر کو بے حس نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

تو یہ تھا وہ اسلام آباد جہاں آنے کی چاہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہشوں میں سے ایک تھی اور اب وہ اس سمیت ہر خواہش سے دستبردار ہو چکی تھی، جب پیاس بجھ جائے تو بھلا پانی کی طلب کب بے چین کرتی ہے۔ اور جب وہ ڈاکٹر رومانہ کے سامنے گئی تو وہ اسے دیکھ کر دنگ رہ گئی تھیں، ان کے ذہن میں ایسی دارین کا تصور ہی کہاں تھا، پہلے دو ابتدائی سیشنز تو خاموشی سے گزر گئے، ان سیشنز میں بس دارین تنہا تھی اور ڈاکٹر رومانہ نے اس سے تفصیلی ڈکشنز کی تھیں اس کی زندگی کے ہر شعبے کو لے کر، ان دونوں سیشنز کے بعد گھر آنے پر وہ انہیں چپ چپ اور الجھی الجھی سی دکھائی دینے لگی، البتہ تیسرے سیشن میں جبکہ ڈاکٹر رومانہ نے حیدر کو بھی شامل کر لیا تھا اور اس میں دونوں کی زندگی کے وہ موڑ زیر گفتگو تھے کہ دارین کی حالت خراب ہونے لگی، وہ کسی سوال کا جواب دینے کے قابل نہ تھی، اس پر مستزاد ہر سوال پر اس کی خاموشی کو دیکھ کر حیدر کا ''بولو دارین'' کہنا اسے سولی

پر چڑھنے کے مترادف لگ رہا تھا، گھر واپسی پر وہ بے حد نڈھال ہو چکی تھی، معمول کے کام نپٹانے کے بعد بھی جب وہ سونے کے لیے کمرے میں نہ آئی تو حیدر کو تشویش نے آن گھیرا وہ اٹھ کر کمرے سے باہر آ گئے، کچن، لان، لاؤنج، سٹور، ہر جگہ چھان ماری مگر وہ کہیں نہیں، وہ پریشان ہوتے ہوئے اسٹڈی میں چلے آئے اور یہیں ان کی نظر اس پر پڑی وہ کتابیں، ڈائریز اور صفحات کے درمیان بیٹھی تھی، ہر چیز اس کے گرد بکھری ہوئی تھی، وہ پاگلوں کی مانند کبھی ایک چیز کھول کر دیکھتی، کبھی دوسری پھر اس نے قلم پکڑا اور ایک ورق پر تیزی سے چلانے لگی، وہ آگے بڑھے اور جب ان کی نظر اس کے چہرے پر پڑی اور وہ ٹھٹک گئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی، وہ آگے بڑھے تھے اور اس کے ساتھ بیٹھ گئے، وہ انہیں دیکھ کر ایکدم سے ڈر گئی، مگر یہ صرف لمحاتی کیفیت تھی، وہ اگلے ہی لمحے بلند آواز میں رونے لگی۔

''میں پاگل نہیں ہوں، سنا آپ نے؟'' روتے چلاتے وہ ان سے کہہ رہی تھی، وہ حیران سے اسے دیکھتے رہ گئے۔

''کیا ہوا دارین؟'' انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا تھا، اس نے تیزی سے ان کا ہاتھ جھٹکا تھا۔

''مجھے کیا ہوا ہے کیا نہیں اس سے آپ کو کیا فرق پڑتا ہے، آپ کو کسی بات سے فرق نہیں پڑنا چاہیے، سنا آپ نے، مجھے پتا ہے آپ کے نزدیک میں کیا ہوں، بہت اچھے سے آگاہ ہوں میں اپنی حیثیت سے، آپ کو قطعاً مجھے بتانے کی ضرورت نہیں، آپ اب کیا چاہتے ہیں؟ مجھے پاگل ثابت کروانا چاہتے ہیں؟ کیوں لے کر جاتے ہیں مجھے اس ڈاکٹر کے پاس کیوں؟'' وہ بلند آواز چلا رہی تھی۔

''کس طرح کی باتیں کر رہی ہو تم؟''

انہوں نے بمشکل اپنے طیش پر قابو پایا تھا۔

اپنے حواسوں میں ہوں، آپ کیا جاننا چاہتے ہیں مجھ سے؟'' وہ پہلے سے بڑھ کر چلائی تھی۔ حیدر کی آنکھوں میں لہو اتر آیا، انہوں نے سختی سے اس کا بازو جکڑ لیا۔

''تمہیں پتا ہے تم کیا کہہ رہی ہو اور کس سے کہہ رہی ہو؟'' وہ غرا کر بولے تھے۔

ایک لمحے کے لیے دارین کا رنگ زرد پڑ گیا، وہ سن سی انہیں دیکھتی رہ گئی۔

''اپنی ماں کی موت کا بدلہ اس طرح لینا چاہتے ہیں کہ کسی کو آپ پر شک نہ ہو، کبھی مجھے چھت پر لے جاتے ہیں تاکہ دھکا دے سکیں، کبھی ڈاکٹر کے پاس تاکہ پاگل ثابت کروا کر پاگل خانے بھیج دیں، اپنے انتقام کے لیے اتنے لمبے چوڑے منصوبوں کی کیا ضرورت تھی بھلا آپ کو؟''

وہ اذیت وغم سے بوجھل ہو کر سرگوشی نما لہجے میں بولی تھی۔

''جسٹ شٹ اپ۔'' انہوں نے لمحہ بھر میں ضبط کھو کر اس کے منہ پر ایک بھرپور تھپڑ مارا تھا، وہ زور سے دیوار سے ٹکرائی۔

''اور میں آپ کو جانتی ہوں بہت اچھے سے، آپ کو کتنا ترس آتا ہے مجھ پر، آگاہ ہوں میں۔'' وہ پتھر نظروں سے انہیں دیکھتی پیچھے کی طرف کھسک رہی تھی، انہوں نے دیکھا وہ سب صفحات اس کے گرد بکھرے تھے جن پر اس نے انہی کے اسکیچ بنائے ہوئے تھے۔

''میں آپ کی قید میں ڈیڑھ سال سے ہوں چوہدری صاحب مجھے بے وقوف نہ سمجھئے گا میں آپ کی سب اداؤں سے واقف ہوں، یہ تو آپ کے ہاں کی رسم ہے کہ قربانی سے پہلے جانور کو خوب کھلاتے پلاتے ہیں، اس لیے اتنی نظر کرم ہے مجھ پر آپ کی کہ مجھے قربان کرنا ہے آپ نے اب کی بار۔'' وہ بدستور دروازے کی جانب کھسک رہی تھی۔

''مجھے اچھے کپڑے پہناتے ہیں جیسے قربانی کے جانور کو سجاتے ہیں، مجھے کھانے کھلاتے ہیں، مجھے سیر کو لے جاتے ہیں، ساری باتیں تو صاف ہیں، سیدھے اشارے، مجھے سمجھنے میں دیر لگ گئی، مگر اب اور نہیں، میں آپ کو ہر پریشانی سے آزاد کر دوں گی، آپ کو اتنی لمبی منصوبہ بندی کی الجھنوں میں نہیں پڑنے دوں گی، میں خود کو ختم کر لوں گی۔'' وہ زہریلے لہجے میں بولتی اٹھی اور یکدم دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی، وہ چند لمحے وہیں ساکت سے بیٹھے رہے پھر ایکدم سے اٹھ کر اس کے پیچھے بھاگے اس کے دوپٹے کی جھلک انہیں کچن میں نظر آئی تھی اور جب وہ ممکنہ تیزی سے بھاگتے ہوئے اس کے پیچھے کچن میں آئے تو وہ چھری کو ہاتھ میں لے چکی تھی اور انہیں کچن کے دروازے میں دیکھتے ہی اس کے چہرے پر عجیب سی نفرت اور وحشت پھیل گئی اس نے پوری طاقت سے چھری ہوا میں بلند کی جیسے ہر قیمت خود کو ختم کر لینا چاہتی ہو مگر وہ زور سے چلائے تھے۔

''دارین! نہیں.....رکو، رک جاؤ دارین۔''

ان کی بلند آواز میں چلانے پر دارین کا ہاتھ لمحہ بھر کو رکا اور اتنی مہلت ان کے لیے کافی ثابت ہوئی تھی وہ تیر کی تیزی سے لپکے اور اس کے ہاتھ کو جکڑ لیا، جب دارین کو اندازہ ہوا کہ وہ ناکام ہونے والی تھی تو غصے بے بسی اور جھنجھلاہٹ میں چھری کو اپنی ہتھیلی میں دبالیا، تیز دھار چھری نے اس کی نرم و نازک جلد کو چیر کر رکھ دیا تھا۔ حیدر نے خوفزدہ ہوتے ہوئے اس کے ہاتھ میں چھری چھیننا چاہی مگر اس کوشش میں وہ مزید زخمی ہوگئی اور جب وہ آخر کار اس سے چھیننے میں کامیاب ہوئے تو وہ بے حد زخمی ہو چکی تھی اور خون تیزی سے فرش پر گر رہا تھا۔

''کیا کر لیا ہے تم نے، تم پاگل ہوگئی ہو؟'' وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے دھاڑ اٹھے تھے، وہ تکلیف اور خوف سے تڑپ رہی تھی۔

''ہاں ہوں میں پاگل، سن لیا سچ، مگر ایک سچ اور بھی سن لیجئے، میں آپ سے نفرت کرتی ہوں، بے حد نفرت اور اس دنیا میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو مجھے آپ سے محبت کرنے پر مجبور کر سکے۔'' نقاہت سے تقریباً گرتے ہوئے اس نے بند ہوتی آنکھوں سے یہ آخری الفاظ کہے تھے اور پھر بے جان گڑیا کی طرح ان کے بازوؤں میں جھول گئی۔

☆.....☆.....☆

اس کی آنکھ آہستہ آہستہ کھلی تو درد اور اذیت کا گہرا احساس اندر تک سرائیت کرتا گیا، وہ ان کے بیڈ روم میں تھی، اس کے ایک ہاتھ پر ڈرپ لگی تھی۔ اور دوسرا ہاتھ پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا، جس سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں، وہ بے حس نظروں سے چھت کو دیکھتی پھر سے وہ سب یاد کر رہی تھی جو ہوا تھا۔

''تو انہوں نے مجھے بچالیا؟'' اس نے حیرت سے سوچا، اسی وقت دروازہ کھلا اور حیدر اندر چلے آئے فون ان کے کان سے لگا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ میں ان کے جوس کا گلاس تھا، اسے جاگتے دیکھ کر انہوں نے فون بند کر دیا اور اس کے پاس چلے آئے، دارین نے انہیں قریب آتا دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں، وہ ان کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی اور جب وہ اس کے پاس آکر بیٹھے تو اس کا دل چاہا وہ وہاں سے بھاگ جائے، وہ بے تاثر نظروں سے اس کو دیکھتے رہے پھر آہستہ آہستہ اس کے گال پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

''اتنا شک اچھا نہیں ہوتا دارین؟ میں اتنا برا نہیں ہوں جتنا تم تصور کرتی ہو، نہ ہی میرا ایسا کوئی ارادہ ہے جیسے تم سوچتی ہو، میں صرف تمہیں ٹھیک کرنا چاہتا ہوں۔ خواہ اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے، تم ابھی بے خبر ہو، آگاہ نہیں ہو کہ تمہیں کیا ہوا ہے، میں جانتا ہوں، تم بیمار ہو، مگر تم ٹھیک ہو جاؤ گی، بہت جلد انشاء اللہ۔'' ان کے انداز میں گہری صداقت تھی، اس کی ڈرپ ختم ہو چکی تھی، انہوں نے اسے اتار کر سائیڈ پر کر دیا اور اس کے برابر لیٹ گئے، دارین کا سانس مدھم ہونے لگا، انہوں نے اس کا زخمی ہاتھ اٹھا کر اپنے سینے سے سر کھا تو اس کے حلق سے کراہ نکل گئی، انہوں نے بے ساختہ اس کا چہرہ دیکھا اور پھر تسلی دینے کے لیے دھیرے سے اس کی پشت کو تھپکا اور اس کے ماتھے پہ لب رکھ دیئے۔

''میں جانتا ہوں تم مجھ سے نفرت کرتی ہو براہ مہربانی مجھے دوبارہ مت بتانا، میرے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں۔'' انہوں نے بہت سپاٹ سے لہجے میں کہتے ہوئے اس کا سر اپنے بازو پر رکھ لیا، اب مزید آنکھیں بند کرنے کی اداکاری کرنا بے کار تھا۔ وہ بے بسی سے سسک اٹھی، کس قدر اذیت ناک تھا ناں کہ وہ ان سے نفرت کا ڈھنڈورا پیٹنے کے باوجود بھی انہی کے بازوؤں میں تھی، ان کے لمس کو سہنے پر مجبور، اس کے رونے پر وہ کس قدر افسردہ ہوئے تھے، پھر اس کا چہرہ اونچا کیا تو وہاں درد اور آنسو تھے، انہوں نے بے ساختہ اس کی آنکھوں پر ہونٹ رکھے تھے اور اس کے سارے آنسو پی لیے۔

دارین کو کچھ اور شدت سے رونا آیا تھا، اس شخص کی مسیحائی بھی جان لیوا تھی۔

☆.....☆.....☆

اور پھر..... بڑا عجیب ہوا، اس نے ہار مان لی، چپ چاپ شکست تسلیم کر کے ہتھیار گرا دیئے، اس نے مان لیا کہ وہ ''بیمار'' تھی اور یہ کسی عجیب بیماری تھی جس میں بظاہر وہ بالکل تندرست تھی مگر اس کے باوجود بھی وہ ادویات کھاتی تھی اور جو جو وہ ڈاکٹر پوچھتی تھی اسے سر جھکا کر بتاتی تھی اور پھر چاہے حیدر ہی کیوں نہ اس کے سامنے بیٹھے ہوئے اسے بولنا پڑتا تھا۔

اور وہ گھر آ کر یوں نڈھال ہو جاتی جیسے کتنی مشقت کر کے آئی ہو، اس کے ہاتھ کا زخم دھیرے دھیرے بھرتا جاتا تھا اور دو دن بعد جبکہ وہ خود اس کے سامنے بیٹھ کر اس کی بینڈیج بدل رہے تھے انہوں نے بڑے اطمینان

سے اسکے ہاتھ وہ پلندہ تھما دیا جو اس دن بکھرا پڑا تھا۔

''یہ اسکیچ مجھے یہ پسند آیا ہے۔'' انہوں نے ایک تصویر نکال کر اس کے سامنے رکھ دی، یہ وہ آخری اسکیچ تھا جو دارین نے بنایا تھا، حیدر کا خوبصورت چہرہ اور اس چہرے پر موجود غصہ، ماتھے پر ناگواری کی شکن اور آنکھوں میں گہری سرخی۔

''تم نے میرا اصلی چہرہ کیسے دیکھ لیا دارین؟'' وہ حیرت سے پوچھ رہے تھے اور وہ جانتی تھی اس حیرت کے پیچھے گہرا طنز اور غیظ و غضب چھپا تھا، اس کے لب کپکپانے لگے اور آنسو ٹوٹی مالا کے موتیوں کی مانند بکھرنے لگے، اس کے پاس آنسوؤں کے سوا کوئی جواب نہ تھا، یہ شرمندگی کیا کم تھی کہ وہ اس کے راز سے آگاہ ہو گئے تھے۔

اس کا زخمی ہاتھ بدستور ان کے ہاتھ میں تھا، اس نے گھٹنوں پر سر رکھا اور سسکیاں بھرنے لگی، وہ چند لمحے اس کو دیکھتے رہے پھر اس کا ہاتھ بڑی احتیاط سے تکیے پر رکھ کر وہاں سے چلے گئے ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اسے اکیلا چھوڑ دیتے۔

☆.....☆.....☆

تنہائی کی گود میں چہرہ چھپا کے
اور لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہ کر
بہائے ہوئے آنسوؤں کی قسم
دکھوں کا کوئی ایک رنگ
کوئی ایک مخصوص شکل نہیں ہوتی۔
تنہائی کی گود میں چہرہ چھپا کے بہائے ہوئے
آنسوؤں کی قسم
ہم تو بس ایسے ٹوٹے پھوٹے کھلونے ہیں
جن کے ساتھ کوئی ضدی اور تند مزاج بچہ
غصے اور چڑچڑاہٹ کے عالم میں

اٹھا اٹھا کر پھینکنا کھیلتا ہے.....!!

آج اس کے ٹیسٹ تھے اور صبح سے ہی وہ عجیب چڑچڑی اور زود رنج ہو رہی تھی، ہر دو منٹ بعد وہ رونے لگتی، حیدر نے بارہا اسے چپ کروانے کی کوشش کی مگر بے سود، آخر وہ ان کے سامنے ضبط کھو بیٹھی۔

''مجھے ڈر لگتا ہے، مجھے کچھ بھی نہیں کروانا، مجھے مت لے کر جائیں کہیں بھی، میں آپ سے التجا کرتی ہوں، خدارا مجھے مت لے کر جائیں، مجھے کوئی ٹیسٹ نہیں کروانا، میں ٹھیک ہوں، مجھے..... مجھے کچھ نہیں ہوا۔'' وہ روتی جاتی تھی، وہ ایک طویل سانس لے کر اس کا ہاتھ تھام کر سہلانے لگے۔

''ڈرنے والی کوئی بات نہیں دارین، میں ہوں گا ناں وہاں تمہارے پاس اور تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی، میں یقین دلاتا ہوں تمہیں اور یہ سب تمہارے لیے ہے دارین، تمہاری صحت کی بحالی کے لیے، اس کے بعد تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔''

وہ بڑے یقین سے اس کے ہاتھ سہلاتے ہوئے اسے تسلی دے رہے تھے، دارین کے آنسو مدھم پڑنے لگے، وہ تو ہمیشہ ٹھیک ہی کہتے تھے، یہ بھی ٹھیک ہی ہوگا، اس نے آنسو ضبط کرتے ہوئے سوچا۔

اس کے بلڈ ٹیسٹ ہوئے اور سی ٹی اسکین لیا گیا اور رات جب وہ اسے گھر لے کر آئے تو انہوں نے باقاعدہ اسے سہارا دینے کے لیے تھاما ہوا تھا، وہ اس قدر کمزوری محسوس کر رہی تھی کہ اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں، انہوں نے آتے ہی اسے بیڈ پر لٹا دیا اور جوس پلایا تھا اور پھر اسے کمبل اوڑھا دیا اور پھر خود بھی اس کے پاس آ گئے اور بہت عجیب ہوا کہ انہوں نے اس دن کوئی فون کال اٹینڈ نہ کی، وہ اسے تسلی دیتے رہے اس کی بیماری کی نوعیت سمجھاتے رہے اور اس کو بتاتے رہے کہ یہ ٹیسٹ اس کی ذہنی کیفیت کو جانچنے کے لیے تھے، اس کے علاوہ ان کا کوئی مقصد نہ تھا، وہ آگے سے بالکل خاموش رہی تھی، سارے راز عیاں ہو گئے تھے اور بڑے غلط وقت پر ہوئے تھے، وہ سوائے بے بس ہونے کے کچھ کرنے کے قابل نہ تھی۔

اس شخص کے انداز و اطوار بدل چکے تھے، وہ اپنے سارے تیر آزما چکا تھا اور اب شاید باقی کچھ نہ تھا اب وہ صرف ان زخموں کو دیکھتا تھا جو اس کے ہاتھوں اس کی باتوں سے اس کے رویے سے لگے تھے اور سوچتا تھا کہ یہ اس نے کیا کر دیا تھا؟

بہت دفعہ ہمارے حصے میں آنے والا نقصان خود اپنے ہی ہاتھوں آتا ہے۔

اب تو وہ بہت دن ہوئے ڈائری بھی نہیں لکھتی تھی، اسے علم تھا کہ وہ اس کی ہر بات ہر احساس سے واقف ہو چکے تھے اور یہی احساس اسے مار ڈالنے کو کافی تھا، وہ ان سے نظریں ہی نہ ملا پاتی، کتنی بری تھی وہ؟ وہ اس کے لیے اتنا کچھ کر رہے تھے اور وہ ان کے بارے میں کیا کچھ لکھتی پھرتی تھی، وہ خود کو اس قدر مجرم محسوس کرتی تھی کہ اس نے سب کچھ اکٹھا کر کے نچلے دراز میں ڈال دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

پھر تین ماہ بعد دارا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کو چھوڑ کر چلا گیا، وہ بالکل تندرست ہو گئی، کھلی رنگت اور روشن چمکدار آنکھوں کے ساتھ وہ ایک چہچہانے والی چڑیا بن گئی۔

حیدر چوہدری نے اسکی زندگی بدل کر رکھ دی تھی، وہ اسے اپنے ساتھ پارٹیز اور فنکشنز پر لے کر جاتے تھے، وہ اسے سوشلائز کر رہے تھے، اس میں کونفڈنس تو تھا مگر وہ اب انہوں نے اسے پالش کر دیا، اب وہ کھل کر ہنستی تھی، ان کے ساتھ باتیں کرتی تھی، مارکیٹ جاتی تھی، اپنی پسند کے کپڑے لیتی تھی۔

ان کے لیے کھانا بناتی تھی، فون پر اپنی امی سے بات کرتی تھی اور وہ آفس جاتے تو وہ انہیں ٹیکسٹ کرتی رہتی، ہاں اب اسے موبائل استعمال کرنا آ گیا تھا اور انہوں نے اسے خود سکھایا تھا پھر اس کے لیے انتہائی اعلیٰ برانڈ کا سیل فون لے کر آئے تھے۔

اس نے اپنے خوبصورت بالوں کو نہایت خوبصورتی سے ترشوایا تھا اور جب شام ڈھلتی اور چراغ روشن ہوتے تو ایسے ہی چراغ اس کے اندر جلتے تھے، وہ خوبصورتی سے بال کھولے سنہری رنگت اور خوبصورت لباس میں ان کا انتظار کرتی تھی۔

اب کہ زندگی بدل گئی تھی، وہ جیسے کوئی شہزادی تھی جو چاند نگر کی حسین وادی پر راج کرتی تھی اور اس کا سنہرا شہزادہ اس کے ناز اٹھاتا تھا، یہ ایک دلکش اور رنگوں سے بھری دنیا تھی، وہ جہاں کی عطر بیز فضا اس کے حسن کو دن بدن نکھارتی چلی جاتی تھی۔

☆.....☆.....☆

''حیدر چوہدری!''

اس کہانی کا دوسرا کردار.....!

یہ قصہ اس کی پیدائش کے بعد شروع ہوا، جب وہ بہت چھوٹا تھا اور اس نے اپنی ماں کا انتہائی خوفناک ایکسیڈنٹ دیکھا جس کے بعد وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہیل چیئر پر آ گئیں، پہلے پہل اسے ماں کو یوں بستر پر بیمار دیکھ کر ڈر لگتا تھا، وہ ان سے دور بھاگتا تھا اور سارا دن ''شیش محل'' کی راہداریوں اور دالانوں میں چکراتے گزار دیتا تھا اور جب تھک کر واپس ان کے پاس آتا تو وہ اسے ساتھ لگا کر اس کا چہرہ صاف کرتیں اور اس کو اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتیں اور پھر اس سے ڈھیروں باتیں کرنے لگتیں، رفتہ رفتہ اسے یہ سب اچھا لگنے لگا اور دوبارہ سے ان کے قریب ہوتا گیا۔

اور گھر میں کوئی اس کا ہم عمر نہ تھا اس لیے وہ لاشعوری طور پر ان ہی سب کچھ ماننے لگا، ماں کی معذوری کے بعد اسے انہیں زیادہ قریب سے جاننے کا موقع ملا اور تب اس پر یہ راز آشکار ہوا کہ اس کی ماں ''خود کلامی'' کی مریضہ تھیں، ان کی نجانے کونسی سہیلی تھی جس سے وہ فرصت کے پہر اپنے دکھ سکھ پھولتی تھیں، بہت دفعہ حیدر ڈر گیا وہ ابھی بچہ تھا پہلے پہل یہ سمجھا کہ شاید ان میں ''سایہ'' آ گیا تھا، گاؤں کے ماحول میں یہ چیز بڑی عام سی تھی، وہاں سے سب لوگ ایسی کسی بھی عادت کو اول اول نظر انداز کرتے تھے اور پھر ''سایہ'' سمجھ کر خوفزدہ ہوتے اور پھر آخر میں اس کا علاج ''عامل'' کے پاس ہوتا تھا۔

وہ بچہ تھا مگر جوں جوں بڑا ہوتا گیا، اس پر عیاں ہوتا گیا کہ یہ ''کوئی سایہ'' نہ تھا بلکہ یہ ایک بیماری تھی، وہ یونیورسٹی کے لیے گاؤں سے باہر نہیں جانا چاہتا تھا مگر باپ کی ضد پر اسے جانا پڑتا اور پھر وہاں کی چکا چوند دنیا نے اسے یوں اپنی طرف کھینچا کہ اسے گھر تقریباً بھول گیا، اب وہ چھٹیوں پر گھر آتا تو وہ سب بھول جاتا اور پھر سے ماں میں مگن ہو جاتا مگر یہ دورانیہ بڑا مختصر سا ہوتا تھا، وہ واپس جاتا تو ایک بار پھر سے ماں کی تنہائی اس کے مشغلہ ذہن سے نکل جاتی، مگر کہیں اندر ہی اندر جب وہ واپس آتا تو یہ خلش پھر سے تازہ ہو جاتی، اب بھی واپس آتا تو یہ خلش پھر سے تازہ ہو جاتی، اب بھی وہ کبھی اچانک ماں کے کمرے میں جاتا تو انہیں خود سے باتیں کرتے دیکھ کر عجیب سے احساس جرم کا شکار ہو جاتا، بہت دفعہ اس نے سوچا کہ وہ ماں کو علاج کے لیے لے جائے تو کتنا اچھا

ہو، وہ ٹھیک ہو جائیں، ایک نارمل انسان جیسی زندگی جئیں۔

اور جب اس کا ماسٹرز مکمل ہوا تو اس نے حتمی فیصلہ کرلیا، اس نے سوچا کہ وہ انہیں اپنے ساتھ لے جائے گا اور کسی سائیکاٹرسٹ سے ان کا علاج کروائے گا اور اس سلسلے میں اسے باپ کی اجازت درکار تھی، مگر جب یہی بات اس نے بابا سے کی تو ایک طوفان کھڑا ہو گیا، بابا کے نزدیک یہ سراسر اس کا پاگل پن اور احمقانہ خیال تھا، وہ اس بات کو تسلیم کرنے پر قطعاً تیار نہ تھے کہ زبیدہ خاتون کسی بیماری میں مبتلا تھیں اور یہ تو ایک عادت تھی جس میں خاندان کی کئی خواتین مبتلا تھیں اور کبھی بھی مردوں نے اسے درخور اعتناء نہ جانا تھا اور اب حیدر کا دماغ جانے کیوں خراب ہوا تھا کہ وہ ایک فضول اور لایعنی بحث لے کر شروع ہو گیا تھا، اس نے ہر طریقے سے بابا کو سمجھانے اور منانے کی کوشش کرلی مگر اس کی ہر دلیل ہر بحث اور حوالہ بے کار گیا، کیونکہ مقابل ''فرسودہ عقائد'' تھے جن کو اپنی جگہ سے ہلانا چٹان کو ہلانے سے بھی مشکل تھا، کئی دن کے بے کار کوششوں اور ان سے سخت ترین جھگڑے کے بعد وہ واپس چلا گیا، ایسا نہیں تھا کہ اسے کوشش چھوڑ دی تھی، بلکہ وہ اسی طرح بار بار انہیں سمجھانے کی کوشش وقتاً فوقتاً کرتا رہتا تھا مگر اس کے باوجود بھی رزلٹ صفر ہی تھا، وہ لوگ اپنے رواجوں اور سوچوں میں اتنے کٹر تھے کہ وہ بری طرح ناکام ہو گیا، یہ ناکامی اور جھنجھلاہٹ ہی تھی کہ اس نے واپس آنے کی بجائے وہیں رہ کر مقابلے کے امتحان کی تیاری شروع کردی اور اسی دوران بابا نے شبینہ سے اس کی بات طے کردی، خود سے ایک سال چھوٹی اس چچا زاد کزن میں اسے ذرہ برابر دلچسپی نہ تھی، ان کی حسن و جمال، ان کا شاعرانہ ذوق ان کی ذہنی سطح اور ان کی تعلیم، سب میں زمین و آسمان کا فرق تھا، باقی شکل و صورت تو خدا تعالیٰ کی دین تھی جسے بہر حال بدلا نہیں جا سکتا تھا، انہوں نے پہلی بار باپ کے آگے کھڑے ہونے کی جرات کی بڑی دلیری سے اس رشتے کو ماننے سے انکار کردیا اور جب ان سے وجہ پوچھی گئی تو جیسا کہ انہیں پتہ تھا کہ یقیناً پوچھی جائے گی اور انہوں نے بڑے اطمینان سے بابا کے سامنے بیٹھ کر کہا تھا۔

''میں شبینہ کی دل سے عزت کرتا ہوں بابا مگر میں اس کی زندگی تباہ نہیں کرسکتا، میں اسے زبیدہ خاتون نہیں بنا سکتا جس کی گھٹن ایک بیماری بن جائے، اس لیے میں معذرت چاہتا ہوں، آپ رشتے سے انکار کردیں،'' اس کے بعد ایک لمبا چوڑا جھگڑا ہوا تھا، انہوں نے اسے عاق کرنے کا فیصلہ کرلیا کیونکہ بات ان کی انا کی تھی مگر اس

سے بھی کچھ حاصل نہ ہوا، حیدر نے کسی بھی قسم کے دباؤ میں آئے بغیر ان کے فیصلے کو قبول کر لیا، اس کا نام ویسے بھی ٹریننگ آفیسرز کی لسٹ میں آچکا تھا، اسے باپ کی دولت کی ضرورت بھی نہ تھی، بابا نے اپنا آخری ترپ کا پتہ بھی ضائع جاتا دیکھا تو شکست خوردگی کے عالم میں ہار مان لی، تقریباً ایک سال تک دونوں باپ بیٹوں کے درمیان بات چیت بند رہی وہ آتا اور ماں سے مل کر چلا جاتا، مگر آخر کب تک؟ وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا اور وہ اپنے بھائی کی خاطر بیٹے کو نہیں گنوا سکتے تھے، یوں انہوں نے بظاہر زبیدہ خاتون کی بات مان کر مگر در پردہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہوئے اسے عاق کرنے کا فیصلہ واپس لے لیا، ہاں مگر اس کے بعد انہوں نے اس کے ساتھ شادی کی بات نہ کرنے کی ٹھان لی اور جب وہ سی ایس پی آفیسر بنا تو پورے علاقے کا فخر بن گیا، وہ گھر آتا تو ملاقاتوں کی لمبی قطاریں اس کی منتظر ہوتیں، مگر اب وہ بہت کم آپاتا اور اس کے باوجود اسے اپنی ماں کی تنہائی کا احساس تھا، وہ کسی صورت انہیں اکیلا نہ چھوڑتا اگر اسکے باپ نے اسے اجازت دی ہوتی اور اگر وہ ان کے علاج کی حامی بھر دیتے تو آج ماں بھی شاید ایک نارمل انسان ہوتیں، اس کے اندر اس چیز کا شدید قلق تھا اور شاید یہی بات تھی کہ جب ماں نے اس کے سامنے شادی کے لیے ''دارین'' کا نام رکھا تو اس نے لمحہ بھر ضائع کیے بغیر ہاں کر دی، اس کے پیچھے بنیادی طور پر دو وجوہات تھیں، پہلی تو یہ کہ وہ ماں کی مرضی مان کر انہیں خوشی دینا چاہتا تھا، دوسری یہ کہ اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو کسی صورت اپنے ساتھ نہ لے کر جائے گا، بلکہ اسے حویلی ہی رکھے گا، وہ اپنے لیے کب شادی کر رہا تھا، اسے صرف ماں کے لیے ایک ساتھی کی ضرورت تھی جو ان کے ساتھ رہے، اگرچہ عیشاں شروع سے ان کی دیکھ بھال کرتی تھی مگر اس کے باوجود ایک بہو اور ملازمہ میں زمین و آسمان کا فرق تھا اور وہ بخوبی آگاہ تھے، اس فیصلے کے مدنظر انہوں نے کچھ بھی دیکھے اور پرکھے بغیر شادی کے لیے حامی بھر لی، ماں کی خوشی دیدنی تھی، انہوں نے بڑھ چڑھ کر شادی کی تیاریوں میں حصہ لیا تھا اور پھر وہ اسے نکاح کے لیے آئے اور سب کچھ ان کے سوچے سمجھے پلان کے مطابق ہوا تھا، وہ مزاجاً کرخت اور سرد مہر تھے، اس لیے انہیں اسے اپنی پسند اور مرضی کے مطابق ڈھالنے میں کوئی مزید پریشانی نہ ہوئی جبکہ وہ تھی بھی گھبرائی سی کم عمر اور قدرے بے وقوف سی لڑکی، مگر وہ خوبصورت بہت تھی اور یہ بات انہوں نے اول دن ہی سے تسلیم کر لی تھی، شادی کے تیسرے دن وہ حسب منصوبہ واپس چلے گئے اور سب کچھ ویسا ہی ہوتا گیا جیسا وہ سوچتے تھے۔

''دارین'' نے سب کچھ سنبھال لیا اب جب بھی وہ فون کرتے ماں کے لبوں پر دارین کا ورد ہوتا اور اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ انہوں نے سختی سے دارین کو تاکید کی ہوئی تھی کہ ماں کو قطعاً تنہا نہ چھوڑا جائے اور وہ جانتے تھے کہ وہ ان کے کس قدر دباؤ میں تھی اور ان سے کتنا ڈرتی تھی اور وہ عین وہی کرتی تھی جو وہ کہتے تھے۔

وہ خوش تھے، ماں کی تنہائی دور ہوگئی، وہ اپنے معمول کے مطابق آتے اور سارا وقت ماں کو دیتے جو کہ اب زندگی سے بڑی مطمئن تھیں اور دارین کو بہو بنانے کے فیصلے پر مطمئن اور خوش تھیں۔

مگر وہ بہر حال ایک مرد تھے اور مرد بھی وہ جو آفسر ہونے کی ساری خصوصیات سے مزین تھے، وہ کہیں نہ کہیں خامی ڈھونڈ ہی لیتے تھے اور ماں کے معاملے میں ذرا سی بھی کوتاہی برداشت نہ کرتے تھے، اسے ڈانٹ کر رکھ دیتے اور انہیں اس بات کی کبھی بھی پرواہ نہ رہی تھی کہ دارین کیا سوچتی تھی اس پر کیا گزرتی تھی اور شاید وہ تا زندگی لاعلم ہی رہتے اگر ماں کی وفات کا حادثہ نہ ہوتا، کس قدر خوفناک تھا ان کے لیے وہ سب؟ یہ کوئی ان سے پوچھتا تھا، تمام ثبوت و شواہد دارین کے خلاف تھے، یہاں تک کہ ماں کی دوائیاں تک غائب تھیں اور تب وہ جو بڑے ٹھنڈے دماغ سے فیصلہ کرنے والے تھے، انہوں نے یہ فیصلہ غصے اور نفرت میں کیا اور انتہائی قدم اٹھاتے ہوئے پنچائیت میں اسے خود پر حرام قرار دے دیا، وہ اسے ایسی سزا دینا چاہتے تھے کہ وہ عبرت کا نشان بن جائے اور پھر انہوں نے اسے قید تنہائی میں ڈال دیا، رہی سہی کسر شبینہ کے بیان نے پوری کر دی، وہ اسے واپس اسی کوٹھڑی میں ڈلوا کر چلے گئے، مگر اس بار کا جانا قیامت ہوا، بیچ راہ میں کھوٹی کرنے کو عیشاں مل گئی اور سارا راز کھل گیا، وہ وہیں سے واپس پلٹے تو بلقیس کے ہاتھوں اتفاقاً ملنے والی اس کی ڈائریز ایک نئی کہانی کا عنوان لیے ان کی منتظر تھیں وہ وقت کا احساس کیے بغیر پڑھتے رہے یہاں تک کہ سحر طلوع ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی ان کی آنکھوں میں رات آئی تھی۔

☆.....☆.....☆

بچن سے ہی ماں انہیں ایک کہانی سنایا کرتی تھیں، چاند نگر کی شہزادی'' کی کہانی اور بڑی عجیب بات تھی، دو چیزیں لازم و ملزوم تھیں ان کا بچپن اور شہزادی جب ماں انہیں شہزادی پر ہونے والے ظلم کی داستان سناتیں تو ان کا خون کھول جاتا، بس نہ چلتا کہ ابھی جائیں اور شہزادی کو اس ظالم دیو کی قید سے آزاد کرا لائیں، اس معصوم

شہزادی کا صرف یہی تو قصور تھا کہ وہ اس خوبصورت دنیا کو دیکھنا چاہتی تھی۔

اتنی معصوم سی خواہش کی کیسی دردناک سزا ملی تھی شہزادی کو، وہ تو پھولوں اور کلیوں کو دیکھ رہی تھی جب وہ ظالم دیو اسے اٹھا کر لے گیا اور پھر، ہر گزرتے دن اس کے پڑھتے ہوئے مظالم، وہ اکثر رات کو سوچتا کہ وہ بھاگ کر جائے اور اس دیو کو مار ڈالے مگر پھر سوچ میں پڑ جاتا کہ بھلا یہ "چاند نگر" کہاں تھا؟

اور بہت دن لگانے کے بعد بہت بے تابی سے اس کہانی کے اختتام کا انتظار کرتے جب اسے یہ پتہ چلا کہ شہزادی مر گئی تو اسے جیسے یقین ہی نہ آیا، اسے تو ساری کہانی میں یہ لگتا رہا تھا کہ کبھی نہ کبھی ضرور کوئی مسیحا آئے گا اور شہزادی کو بچا لے گا، شہزادی کے لیے ضروری کوئی شہزادہ آئے گا تو سنہرے چمکدار رنگ والا مشکی گھوڑے پر سوار اور جس کی تلوار لشک رہی ہوگی، وہ یقیناً آئے گا اور شہزادی کو اس دیو کی قید سے آزاد کرا لے جائے گا مگر اس کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی اور شہزادی اس ظالم کے دیئے زخم سہتی سہتی اس دنیا سے چلی گئی، شاید اسے اب یہ یقین نہ رہا تھا کہ کوئی اسے بچانے آئے گا اور جب اس کی امید ہی مر گئی تو اس نے زندہ رہنا مناسب نہ سمجھا، وہ بھی مر گئی۔ اس رات وہ سو نہ سکا، بس کمبل میں منہ چھپا کر روتا رہا، اتنا دکھ تھا کہ بیان سے باہر تھا۔

اس کے بعد اس نے ماں سے کہانی سننا چھوڑ دی، بھلا کیا فائدہ ایسی کہانیوں کا جن کا انجام اتنا برا ہوا۔

جس کے آخر میں بھی شہزادی کے دکھ کم نہ ہوں اور نہ ہی اس کی زندگی میں کوئی خوشگوار موڑ آئے، ماں کو حیرانی ہوئی جب ان کے کہنے پر حیدر نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مجھے کوئی کہانی نہیں سننی اور اس کی روح میں چاند نگر کی شہزادی کا غم اتر گیا، اس نے سوچا وہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر شہزادی کو بچا سکا تو ضرور بچائے گا۔

☆.....☆.....☆

انہوں نے ایسا کب چاہا تھا، بھلا یہ کب سوچا تھا وہ تو دارین کو ماں کے لیے لے کر آئے تھے، انہیں بڑا اطمینان ہو گیا تھا، دارین ماں کا خیال ہی اتنا رکھتی تھی کہ مطمئن ہو گئے، کچھ اس میں دخل ان کے مزاج کا بھی تھا، وہ اسے کسی صورت رعایت نہیں دیتے تھے اور ان کی اس عادت نے دارین کو کس طرح نقصان پہنچایا اس کا اندازہ انہیں بعد میں ہوا۔ جب انہوں نے ماں کی وفات کے بعد پہلی مرتبہ اسے خود کلامی کرتے دیکھا تو انہیں یقین نہ آیا، وہ حیران و پریشان سے واپس پلٹے اور اس کے گھر رابطہ کیا مگر وہاں سے جو پتہ چلا وہ پہلے سے بڑھ کر

ناقابل یقین تھا۔

''دارین بھی ماں کی طرح نفسیاتی عارضے کا شکار تھی۔'' ان کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی، یہ کیسا جوتا مارا تھا تقدیر نے انہیں۔ وہ جس لڑکی کو ماں کے لیے لے کر آئے تھے وہ لڑکی جسے انہوں نے اس قابل نہ جانا تھا وہی لڑکی اب خود اسی مرض کا شکار تھی۔

یہ کیسا مکافات عمل تھا؟

انہیں وہ دن یاد آیا جب وہ اس کمرے میں گئے اور وہاں تاریکی تھی اور دارین کی سسکیاں، انہیں دیکھ کر وہ کیسے لپکتی ہوئی آئی اور ان کی ٹانگ سے لپٹ گئی اور اس رات جب وہ اسے اٹھا کر اپنے کمرے میں لائے تو یوں تھے جیسے ان کے بازو لکڑی کے بن گئے ہوں اور دل جلتا شعلہ، ایک آگ تھی جس سینہ ہر پل پل جل رہا تھا۔

وہ جس سے ماں کو بچانا چاہتے تھے اسی بھنور میں دارین کو دھکیل بیٹھے تھے، اس رات اس کے کمزور چہرے کو دیکھتے ہوئے وہ اندر سے انتہائی دکھی تھے، ساری بازی الٹ گئی تھی، انسان کس قدر بے بس و مجبور ہے، جس سے بھاگتے ہیں اسی سے جا ٹکراتے ہیں۔

وہ جو بڑے بااختیار آفیسر تھے، یہاں ان کے اختیارات ختم ہو گئے، وہ جو بڑے ایماندار آفیسر تھے، اپنی ذاتی زندگی میں اتنی بڑی بے ایمانی کر گئے، بات پھر وہیں آ کر ختم تھی، انسان ٹھوکر کھا کر کیوں سنبھلتا ہے، پھر انہوں نے اپنی زندگی کے مشکل ترین قدم اٹھائے تھے، اسے پنچائیت میں بے گناہ ثابت کیا، اپنی قسم کا کفارہ ادا کیا، اسے اپنے ساتھ اسلام آباد لے کر آئے اور سب سے بڑی ذلت، اس کا ٹریٹمنٹ شروع کروایا، ہر راز، ہر بھرم، ہر انداز عیاں ہو گیا۔

ایک سائیکاٹرسٹ کے سامنے شاید ان کی عزت رہی یا نہیں مگر خود کی اپنی نظروں میں ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ اتنا آسان کب تھا اتنے بڑے فیصلے کرنا، وہ انگاروں پر چلتے تھے اور تپش سے ان کا دل جلتا تھا، خاندان سب سے بڑی بلیک میلنگ، ان کی انا کو کس قدر ٹھیس پہنچی تھی، ان کی عزت نفس، مگر سب کے طعنے تشنے، ملامت اور نفرت اور سب سے بڑی چیز باپ کی مخالفت وہ سب سہار گئے، جس چیز سے بچنے کے لیے انہوں نے شبینہ سے شادی سے انکار کیا تھا، وہی چیز دارین کے حصے میں آ گئی تھی، اس کی اذیت کیا کم تھی، وہ جتنا سوچتے ان کا

دماغ اتنا ہی کھولتا، یہ کیا ہو گیا تھا، انہیں کبھی بھی خود پر ہنسی آتی، بڑی صدماتی سی ہنسی۔

یہ ''تقدیر'' تھی ان کی تقدیر جس سے وہ ''تدبیر'' سے بھی نہ لڑ سکے، کہ بعض چیزیں اس طرح سے نوشتہ تقدیر ہوتی ہیں کہ انہیں بدلنا ممکن نہیں ہوتا، ان کی قسمت میں وہ آیا تھا جس سے وہ بھاگتے تھے اور پھر انہوں نے سوچا، اگر وہ ماں کو خوش اور تندرست نہ دیکھ سکے تو شاید اللہ نے انہیں آزمانے کے لیے دارین کا دکھ دے دیا کہ اگر وہ اپنے وعدے میں اپنے عہد میں اتنے ہی سچے تھے تو کیوں نہ وہ دارین کو تندرست دیکھیں۔

اگر انہیں اتنا ہی دکھ تھا ماں کا علاج نہ ہو سکنے کا تو کیوں نہ وہ دارین کا علاج کروائیں اب؟ اور جب آزمائش پڑ ہی گئی تو انہوں نے پورا اترنے کے لیے ہر چیز کی قربانی دے دی۔

اپنے نام کے ''حیدر چوہدری'' وہ انسان جس سے اس کے ہائی آفیشلز بھی سنبھل کر بات کرتے تھے کیونکہ وہ خود دوٹوک اور سرد مہر تھے، اب اتنے ڈاؤن ٹو ارتھ ہو گئے کہ دارین کی چیخ اور چنگھاڑ پر بھی چپ رہتے تھے اور جب وہ روتی تھی تو ان کے دل پر خنجر چلتے اور وہ لہولہو ہو جاتے تنہائی یوں مار مارتی ہے انہیں پتہ ہی کب تھا؟ اس کی ٹریٹمنٹ میں لحہ لحہ اس کا خیال رکھا تھا انہوں نے ہر قدم اس کا ساتھ دیا۔ وہ ٹھیک نہیں تھی اور سے ٹھیک کرنا اتنا آسان نہیں تھا، وہ شک کرتی تھی اور ڈرتی تھی اور اس کی بے یقینی اور خوف کم کرتے کرتے وہ لاشعوری طور پر اس کے قریب آتے گئے۔ اور تب انہیں پتا چلا وہ تو بڑی پیاری اور حساس سی لڑکی تھی، جو کہ رنگوں اور خوشبوؤں سے پیار کرتی تھی جسے کھلکھلاہٹیں بھاتی تھیں اور جو بڑی شوخ تھی۔ تو آہستہ آہستہ انہیں وہ پسند آنے لگی، جب وہ فون پر بات کرتے تو اس کا دلربا نظروں سے خود کو دیکھنا انہیں بھاتا تھا اور جب ہنستی تو وہ اس کے گالوں کے گڑھے انہیں مسحور کر دیتے اور جب وہ فون پر اپنی ماں سے بات کرتی تو ان کے اندر ڈھیروں اطمینان اتر آتا۔

وہ اسے بدل رہے تھے، وہ اسے اپنے ساتھ لے کر جاتے تھے، اسے لوگوں سے متعارف کرواتے تھے، اس کی دنیا کا دائرہ وسیع کر رہے تھے، اسے سنورتا دیکھنا چاہتے تھے اور پھر وہ دن آ گیا، جب وہ مکمل طور پر تندرست ہو گئی، اس کے وجود سے لپٹی بیڑیاں اتر گئیں، اس کی روح سے چمٹے آسیب دور ہو گئے اور وہ صرف ''دارین رہ گئی، حیدر کی دارین!!!''

☆.....☆.....☆

گاڑی روش پر ہموار انداز میں پھسلتی ہوئی رک گئی، آہستگی سے دروازہ کھول کر وہ باہر آ گئے، یہ ان کے گھر آنے کا وقت نہیں تھا مگر اس کے باوجود آج کچھ ایسا خاص ہوا تھا کہ ان کے معمول میں تبدیلی آ گئی تھی۔

وہ سیدھے چلتے ہوئے لاؤنج میں آئے تو پہلی نظر میں ہی وہ ان کو نظر آ گئی۔ بالوں کو کیچر میں سمیٹے صوفے پر نیم دراز، ہاتھ میں اسٹرابیری شیک کا گلاس تھامے وہ بڑی فرصت سے ٹی وی کے چینلز سرچ کر رہی تھی، انہیں دیکھ کر پہلے اس کے چہرے پر حیرت پھیلی اور پھر بے ساختہ خوشی، پھر اس نے ہاتھ میں پکڑا گلاس ٹیبل پر رکھا اور کھڑی ہو گئی تب تک وہ اس کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔

''پلیزنٹ سرپرائز۔'' وہ کھلکھلا کر بولی تھی، وہ ہلکا سے مسکرا کر صوفے پر بیٹھ گئے۔

''کچھ لیں گے آپ؟'' اس نے پوچھا۔

انہوں نے ہلکا سا مسکرا کر نفی میں سر ہلایا اور اسے پاس آنے کا اشارہ کیا، وہ ان کے ساتھ بیٹھ گئی، کچھ الجھن سی بھی محسوس ہو رہی تھی جیسے وہ کچھ چھپا رہے تھے۔

انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے دیکھا اور پھر بے ساختہ ہنس پڑے۔

''آئم سو ہیپی، یو ہیو سرپرائزڈ می سویٹ ہارٹ۔'' انہوں نے اس کا ہاتھ ہلکے سے دبا کر چھوڑ دیا۔

اسنے ناسمجھی سے انہیں دیکھا، انہوں نے وہ فائل فولڈر اس کی طرف بڑھا دیا جس میں ایک امید تھی۔

اور اس پیپر کو پڑھتے ہوئے دارین کے گالوں پر شفق پھیل گئی، اس نے سرخ چہرے کے ساتھ خود کو چھپانا چاہا، لرزتے ہاتھوں سے اس فائل کو ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا اس بے حد شرم آ رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر بے ساختہ ہنستے اور آگے جھک کر اس کے چہرے پر ڈھکے ہاتھوں کو لبوں سے چھوا اور اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے سوچا زندگی آسان ہو گئی تھی۔

وہ جو دل پر بڑا بوجھ رکھتے تھے آج اس بوجھ سے خود کو قدرے آزاد محسوس کرتے تھے، اس کی یہی ادائیں تو انہیں پاگل بناتی تھیں اور جب وہ رات سونے کے لیے کمرے میں آئی تو وہاں بہت سے پھول تھے اور ایک دلکش رنگوں سے سجا ایک کارڈ تھا جس میں انہوں نے اپنی خوبصورت ہینڈ رائیٹنگ میں کچھ سطریں لکھیں تھیں۔

''اس خوبصورت لڑکی ہمت کے لیے جس نے اپنے ٹوٹے وجود سے دوسروں کو جوڑا، اپنے حوصلے سے

دوسروں کو سہارا دیا اور اپنے ریزہ ریزہ دل سے میرا دل جیتا۔" (حیدری چوہدری

ہوسکتا ہے ہمارے اردگرد بہت سی دارین اور زبیدہ خانم ہوں جو تنہائی کی ماری، اپنے احساسات و جذبات کو کسی سے شیئر نہ کر سکنے پر خود کلامی میں مبتلا ہوں۔ بہت سی خواتین کو ساری زندگی یہ ہی سمجھ نہیں آتی کہ یہ مرض ہے کیوں کہ ہم لوگ اسے عادت سمجھتے ہیں ہم اسے بیماری سمجھنے کو تیار ہی نہیں۔ زندگی میں ہر لڑکی کو حیدر چوہدری بھی نہیں ملتا اور ایسے ہی کسی مسیحا کی تلاش میں زبیدہ خانم جیسی بہت سی خواتین دنیا سے چلی جاتی ہیں۔

یہی سچ ہے اور یہی زندگی ہے اور اسے ایسے ہی رہنا ہے، مگر ایک بات بھی پیش نظر رہے کہ نرم رویے، شیئرنگ اور باہمی احترام سے بہت کچھ بدلا جاسکتا ہے، بس ذرا سا حوصلہ اور ہمت دکھانے کی بات ہے۔

☆.....☆.....☆

"چاند نگر کی شہزادی"

کے وجود میں گڑے کیل نکال دیئے گئے، اسکا مسیحا لوٹ آیا تھا، جس نے اپنی محبت سے سب بدل دیا تھا، اسے اس ظالم دیو کی قید سے آزاد کرایا تھا اسے واپس اس کی رنگوں بھری دنیا میں لے آیا تھا۔ اس بار شہزادی کا سنہرا شہزادہ لوٹ آیا تھا، اسے بچانے کے لیے ہاتھ میں چمکتی تلوار لیے اپنے مشکی گھوڑے پر سوار ساری رکاوٹیں عبور کر کے آیا تھا اور اسے لے گیا تھا، شہزادے نے اس بار اپنی شہزادی کو بچا لیا تھا اور پھر وہ اپنی خوشیوں بھری، رنگوں سے سجی اور دھنک سے چمکتی دنیا میں آ گئے، جہاں اب صرف ہنسی تھی، خوشی تھی اور سکون۔

یارب اس بار تو ہمیں ایسی عید دے
جو باہمی خوشی کی سب ہی کو نوید دے
جھگڑے، لڑائی اور سب بحران ہوں ختم
ہر لحظہ پاکستان کو خوشیوں کو نوید دے